جلد ۸۵ جون ۱۹۷۶ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاهور

فہرست مضامین

جلد ۸۵ | جون ۱۹۷۶ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر:- محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اگر کسی شخص کا اندازہ کسی معاملہ میں صحیح نکلے تو اُسے بالعموم بڑی مسرت ہوتی ہے کیونکہ اس سے اُس کی ژرف نگاہی اور پیش بینی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اندازہ کی صحت پر احساس خود اعتمادی پیدا ہونے کے باوجود انسان بسا اوقات اِس بات کا شدید آرزومند ہوتا ہے بلکہ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دُعائیں مانگتا ہے کہ قادرِ مطلق اُس کے اندازوں کو غلط ثابت کر دے۔ ہم جب اپنے کسی عزیز کی صحت کو سُرعت کے ساتھ گرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مہلک مرض میں وہ غریب مبتلا ہے اُس سے شفایابی کے بھی امکانات قریب قریب معدوم ہیں تو اُس کے حسرتناک انجام کے بارے میں یقینی اندازے کے باوجود ہمارا دل یہ چاہتا ہے کہ خدا کرے اِس عزیز کے بارے میں ہمارے خدشات غلط ثابت ہوں اور شافیٔ مطلق ہمارے اندازے کے برعکس اُسے جلد از جلد شفایاب کر دے۔

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں قریب قریب اسی طرح کے احساسات ہر اُس شخص کے اندر پائے جاتے ہیں جو اسلام اور اِس کی نسبت سے پاکستان کے ساتھ گہری محبت رکھتا ہے۔ حالات کا دھارا جس رُخ جا رہا ہے اُسے دیکھنے سے اِس مملکت کے ہر دردمند شہری کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے کیونکہ اُسے بادنیٰ تامّل اِس امر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مُلکی ترقی کے بارے میں بلند بانگ دعووں کے باوجود جو اربابِ اختیار صبح و شام کرتے ہیں، ملک تباہی کے راستہ پہ گامزن ہے اور کسی خوفناک انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔ لیکن اِس اندوہناک حقیقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی دل بہرحال یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہو، اور خداوند تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے کام لیتے ہوئے ہمارے یاس انگیز اندازوں کو غلط ثابت

کر دے، کیونکہ یہ وہ اندازے ہیں جن کا صحیح ثابت ہونا پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے انتہائی تشویشناک ہے۔ اِس وقت ملکی حالات کا مشاہدہ کرنے والوں اور اس مشاہدے کی روشنی میں پاکستان کے مستقبل کا اندازہ کرنے والوں کی عجیب و غریب کیفیت ہے۔ وہ جب ملک کی المناک صورتِ حال اور اُس سے پیدا ہونے والے دردناک نتائج پر غور کرتے ہیں تو اُن کے دل کانپ اُٹھتے ہیں، بخصوصاً جب اُنہیں اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ملک کے اندر اب اِس قدر بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ اُس کی اصلاح کی بظاہر کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی، لیکن اُن کے ذہن اِن رُوح فرسا حقائق کو جاننے کے باوجود حسرتناک انجام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور تاریکیوں میں گھِر کر بھی وہ کسی خوشگوار انجام کی توقع باندھ لیتے ہیں۔

ہماری توقعات خواہ کتنی ہی دلفریب ہوں اور ہمارے دل ناخوشگوار حالات سے اچھے نتائج اخذ کرنے کے لیے خواہ کتنے ہی بیتاب ہوں، لیکن ہم اسے ملک اور قوم کے حق میں کوئی خیر خواہی نہیں سمجھتے کہ اہلِ پاکستان کو حقائق سے اغماض برتنے کا درس دیا جائے اور انہیں ایک ایسی رجائیت سے لذت آشنا کرنے کی تدبیر کی جائے جس کی سرے سے کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہ ہو۔ انسان کو بلاشبہ یاس و قنوطیت کا شکار نہ ہونا چاہیے کیونکہ جس شخص پر اس کے منحوس سایے پڑ جاتے ہیں وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن ہم اسے کوئی عقلمندی نہیں سمجھتے کہ ملکی حالات رُوبہ تنزّل ہوں اور ہم عوام کو یہی باور کراتے رہیں کہ اُن کا وطن عنقریب اس کرۂ ارضی پر جنّت کا نمونہ پیش کرنے والا ہے۔ ہم اس فریب دہی سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور قوم کے سامنے ملکی حالات کی صحیح تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اصلاحِ احوال کے لیے فکرمند ہو۔

اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں سب سے زیادہ دلفگار اور تشویشناک حقیقت جواب پوری طرح کھل کر سامنے آ چکی ہے، یہ ہے کہ اِس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بلکہ اشتراکی مزاج کی حامل غیر مذہبی ریاست بنایا جا رہا ہے، اور خدمتِ اسلام کے متعلق حکومت کے سارے بلند بانگ دعوے، اور اُس کی سربلندی کے لیے نیک اور مقدس آرزوؤں کا پیہم اظہار اور اُس سے محبت و عقیدت کے مختلف مظاہرے سب نمائشی کام ہیں تاکہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اگر اسلام کا نام لینے سے کچھ حلقوں کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہو تو اُسے حاصل کر لیا جائے ورنہ جہاں تک اسلام سے حقیقی دلبستگی اور قلبی وابستگی کا تعلق

ہے اُس کا حال تو اب سب کو معلوم ہو چکا ہے۔ اِس وقت ایک فرد پُورے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اُسی کے اشارۂ ابروئے چشم سے یہاں سارے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی بہت بڑی اکثریت اُسی کے تیور دیکھ کر کوئی رائے قائم کرتی اور کوئی قدم اُٹھاتی ہے۔ اتنے غیر محدود حاکمانہ اختیارات رکھنے کے باوجود اگر اسلام کے عملی نفاذ سے گریز کیا جاتا ہے تو اسے پاکستان کے دینی مستقبل کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں کہا جا سکتا۔

معاملہ اسلامی نظام کے نفاذ سے گریز کا ہی نہیں بلکہ اُس غلط رجحان کا ہے جسے اسلام کے مقابلے میں تقویت بہم پہنچائی جا رہی ہے۔ اسلام ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔ اِس لیے وہ افکار و معتقدات سے لے کر اخلاق و قانون، معیشت و سیاست، تہذیب و تمدن، اور ادب و فن کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے، اور اس بنا پر کسی ایسے نظریہ یا طرزِ عمل کو گوارا نہیں کر سکتا جو اِس سے واضح طور پر متصادم ہو۔ اب اگر کوئی حکومت اسلام کی محبت کا دم بھر کر اُن فکری رجحانات اور عملی سرگرمیوں کی سرپرستی کرے جو دینِ حق کی عین ضد ہیں تو اِس مکّارانہ اصولِ حکمرانی سے ممکن ہے ایک سے زیادہ طبقوں کو کچھ وقت کے لیے بے وقوف بنایا جا سکے لیکن اِس سے عظمتِ اسلام کی راہ تو ہموار نہ ہوگی، بلکہ ملک کے اندر شدید نوعیت کا فکری خلفشار اور عملی انتشار پھیلے گا، جو بالآخر ملّت کے لیے بڑے مہلک نتائج پیدا کرے گا۔ نصب العین کے بارے میں واضح شعور اور اُس کے متعلق پوری یکسوئی حاصل کیے بغیر تو ایک فرد بھی کسی قرینہ کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا کجا کہ ایک قوم کو مختلف کشتیوں میں سوار کر کے اور انہیں مختلف سمتوں کی طرف کھینے کے بعد اُسے یہ مژدۂ جانفزا سنایا جائے کہ اُس کی منزل قریب آ رہی ہے۔ ژولیدہ فکری اور پریشان نظری سے قوموں کے اندر تعمیر و ترقی کی صلاحیتیں نہیں اُبھرتیں بلکہ تخریب کے رجحانات ہی پرورش پاتے ہیں جو اُس کی اجتماعی زندگی کو عذاب بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

آپ اگر پاکستان کی تاریخ میں حکمرانوں کے سیاسی کردار کا جائزہ لیں تو آپ کو ایک دو قابلِ احترام مستثنیات کے علاوہ ایک رجحان بڑا نمایاں نظر آئے گا کہ یہاں جو شخص بھی مسندِ اقتدار پر براجمان ہوا اُس نے دینِ اسلام سے اپنی گہری محبت کا اظہار و اعلان تو ضرور کیا لیکن اللہ تعالیٰ کے دینِ برحق کو اس

ملک کا دستورِ عمل بنانے کے لیے کوئی قابلِ ذکر کوشش نہ کی، بلکہ اجتماعی معاملات میں اسلام سے ان فرمانرواؤں کی عدم دلچسپی دیکھ کر یوں احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ حق اور باطل کی باہمی آویزش میں خاموش تماشائی بن کر گوناگوں لذت محسوس کرتے رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اُن کی غیر جانبداری کا فائدہ باطل ہی کو پہنچتا ہے اور اُس کے اندر آگے بڑھنے کی جرأت اور حوصلہ پرورش پا چکا ہے۔ چنانچہ زبان کی حد تک اسلام کے اِن شیدائیوں اور عملی زندگی میں اسلام کے اِن خاموش تماشائیوں کے ناقابلِ فہم طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر بے پناہ قربانیوں سے حاصل کیا گیا تھا وہاں کچھ افراد اور گروہوں کے اندر دینِ حق کے خلاف کھُلم کھُلا دل آزار باتیں کرنے کی جسارت پیدا ہو چکی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس ملک کا حکمران طبقہ اسلام کے بارے میں اس طرح کا غیر معقول اور ناپسندیدہ رویّہ کیوں اختیار کر رہا ہے۔ کیا اس کی وجہ اُس کی پست ہمتی ہے یا دینی تقاضوں سے عدم واقفیت۔ نیتوں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہم نہ تو اِن حضرات کو دوں ہمت سمجھتے ہیں، اور نہ دینِ اسلام اور اُس کے منطقی تقاضوں سے ناآشنا! اگر یہ لوگ دوں ہمت ہوتے تو اپنے گوناگوں اُمور عزائم کی تکمیل میں وہ ایسا جابرانہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے اختیار کیے رکھا ہے۔ اسی طرح اُن کے بارے میں عقل یہ بھی باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ وہ دین اور اُس کے تقاضوں کو نہ جاننے کی وجہ سے بسا اوقات ایسی حرکات کر بیٹھتے ہیں جو دینی حلقوں میں اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔ اِن حضرات کی غیر دینی سرگرمیوں کا اگر دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پورے شعور اور مضبوط ارادے کے ساتھ ایک ایسی غلط راہ پر گامزن ہیں جس سے حق کی منزل دُور اور باطل کی منزل قریب تر ہو رہی ہے۔ البتہ قوم کو بڑے پُر فریب انداز میں غلط سمت کی طرف آگے دھکیلا جا رہا ہے کہ اُس کی عظیم اکثریت کو اِس امر کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جس خوفناک راہ پر گامزن ہے اُس کا انجام کار کیا ہے۔ آپ ان حکمرانوں کی ہنرمندی اور پُرکاری ملاحظہ فرمائیں کہ اسلام کے نام پر جو نمائشی کام ممکن ہو سکتے ہیں، انہیں کرنے میں وہ بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جو کام دین کی بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتے ہیں انہیں یا تو برابر ٹالا جاتا ہے یا اُن کے بارے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے کی پیہم کوششیں کی جاتی ہیں۔ آج ہماری حکومت کو سب سے زیادہ دلچسپی مزاروں پر عُرسوں کا اہتمام کرنے، میلے لگانے اور قوالی کی

محفلیں منعقد کرانے سے معلوم ہوتی ہے اور ان کاموں کو وہ اپنی بیش قیمت خدمات کے طور پر قوم کے سامنے پیش کرتی ہے اور ان "نمائشی کاموں" کے برعکس وہ کام جو فی الحقیقت دین کی اساس اور بنیاد ہیں اُن سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت مسلسل پہلو تہی کی جارہی ہے۔ جہاں تک منکرات کے استیصال کا تعلق ہے اس میں سارے دینی طبقے ایک دوسرے سے پوری طرح متحد و متفق ہیں لیکن ان برائیوں سے قوم کو نجات دلانے کی قطعاً کوشش نہیں کی جاتی۔ خود حکومت کی طرف سے شائع کردہ اعداد و شمار اس بات کی شہادت فراہم کر رہے ہیں کہ ملک کے اندر شراب، جوا اور فسق و فجور کا کاروبار زوروں پر ہے۔ کیا حکومت ان منکرات کی بیخ کنی سے عاجز ہے یا وہ جان بوجھ کر اس فرض کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کر رہی ہے؟ اس ملک کے حکمرانوں کے خشمگیں تیور دیکھتے ہوئے پہلی توجیہہ تو کسی اعتبار سے بھی قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتی۔ برسرِ اقتدار طبقوں کا یہی معاندانہ طرزِ عمل بھلائیوں کے معاملے میں نمایاں ہے۔ اصحابِ اقتدار کی اسلام کے بارے میں اس غلط روش کو، جسے کسی ناسمجھی کی بنا پر نہیں بلکہ جان بوجھ کر اختیار کیا گیا ہے، دیکھتے ہوئے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ انہیں اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ کسی طرح گوارا نہیں بلکہ اس کی جگہ اسلام کے لیبل کے ساتھ غیر اسلامی نظامِ زندگی کی عملداری مقصود ہے۔

بعض لوگ استعجاب کے عالم میں پوچھتے ہیں کہ جب اس ملک کے حکمران اپنے وسیع اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں، تو آخر یہ کھل کر اسلام سے اپنی بیزاری اور عداوت کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ اس غیر مخلصانہ روش سے جو انہوں نے دینِ حق کے متعلق اختیار کر رکھی ہے اُن کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ کمی ہی ہوئی ہے۔ اگر انہیں اشتراکیت پسند ہے تو انہیں پوری یکسوئی کے ساتھ اس ملک میں اس لادینی نظام کو نافذ کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نام پر اشتراکیت کی سربلندی کا ناپاک عزم ملک اور قوم کی کوئی مفید خدمت نہیں۔ آخر روس اور چین کے حکمرانوں نے عوام کے مذہبی جذبات کو کچلتے ہوئے وہاں اشتراکی نظام نافذ کیا ہے۔ اگر وہاں یہ خونی ڈرامہ کھیلا جا سکتا ہے تو پاکستان میں اس سے کیوں گریز کیا جا رہا ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ اس نہج پر سوچنے والوں نے حقائق و حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کیا۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی عظیم اکثریت اسلام سے جذباتی لگاؤ رکھتی ہے۔ پھر اُس کے

قلب و دماغ میں ابھی تک اپنی منزل کا شعور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ دینی روایات عوام کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں حکمران طبقہ کی طرف سے اسلام کے خلاف کسی علانیہ بغاوت کا اظہار اس کے لیے بہت زیادہ مشکلات اور مسائل پیدا کر سکتا ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کی یہاں کے حکمرانوں میں اہلیت نظر نہیں آتی۔

مزید برآں اِس ملک کے با اختیار طبقہ کو اِس بات کا بھی پوری طرح علم ہے کہ اللہ کے دین کو مٹانے کے لیے مختلف ممالک میں جو سازشیں ہوئی ہیں اُن کا کیا حشر ہوا ہے! اسلام کو جس شدّت کے ساتھ مختلف مقامات پر دبایا گیا وہ اُس سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اُبھرا اور نہ صرف عوام کی توجہ کا مرکز بنا بلکہ اُس نے مسلم معاشرے میں اپنے لیے لاتعداد فدائی اور جان نثار پیدا کیے اور غیر مسلم حلقوں کو اچھا خاصا متاثر کیا۔ چنانچہ تشدد کے اس ناکام تجربہ کو دیکھتے ہوئے اب دینِ حق کے اثر و نفوذ کو روکنے کے لیے یہ حربہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ مسلم معاشرے میں ایسا ہمہ گیر انتشار پیدا کیا جائے جو اسلام کے اساسی معتقدات سے لیکر اُس کی عملی جزئیات تک سب پر پوری طرح محیط ہو تاکہ افرادِ ملّت کے دل و دماغ پریشان فکری کی وجہ سے صحیح طور پر کام کرنا چھوڑ دیں۔ ان کی قوتِ عمل تذبذب کی بنا پر مفلوج ہو جائے اور نا اُمیدی کے سیاہ بادل اُن کے مستقبل کو تاریک بنا دیں۔

معلوم نہیں ہمارے ملک کے حکمرانوں نے تاریخ سے کبھی کوئی اچھا سبق سیکھا ہے یا نہیں، لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ماضی اور حال کے گلستانوں سے پھولوں کو چھوڑ کر کانٹے چننے میں بڑے مشاق ہیں اور یہ کام اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر کرتے ہیں کہ یہ کانٹے دوسروں کے لیے تو باعثِ آزار ہو سکتے ہیں لیکن اُن کے لیے ہر حال میں موجبِ راحت ہی ہوں گے۔ چنانچہ ہمارے ملک کے حکمران اِن کانٹوں کا تاج بنا کر بخوشی پہن لیتے ہیں اور اُس وقت تک اُسے اپنے سر سے جدا نہیں کرتے جب تک کہ تاج میں جڑے ہوئے یہ کانٹے اُن کے سروں کو پوری طرح لہولہان نہیں کر دیتے۔ ان حضرات نے حالات اور واقعات کے مشاہدے سے بھلائی کی کوئی بات اخذ کرنے کے بجائے ہمیشہ بُرائی ہی اخذ کی ہے۔ یہاں ہم اپنے ملک کے حکمرانوں کے منفی رجحانات کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں ایک اہم سبق یہ ملتا ہے کہ کسی قوم کی تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب اُس کا فکری انتشار ہے۔ جو قوم اِس مرض سے محفوظ ہے وہ ہر قسم کے خارجی اور داخلی دباؤ کو برداشت کر سکتی ہے۔ اگر وہ ایک مرتبہ ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جائے تو پھر وہ جلد ہی بحیثیت ایک باوقار اور آبرومند قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا سبق ہے جسے رُوبہ انحطاط قوم کے اربابِ بست وکشاد اگر صحیح طور پر اخذ کرلیں اور اُس کی روشنی میں تعمیر و ترقی کا کوئی منصوبہ تیار کر کے سرگرمِ عمل ہوں تو قوم کے زوال کو عروج میں بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی خلفشار کے متعلق تاریخ کے اوراق ہمیں اِس امر کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی قوم اِس مہلک عارضہ میں گرفتار ہو جائے تو اسے بڑی آسانی کے ساتھ آمریت کی ظالمانہ جکڑ بندیوں میں جکڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی قوم یا معاشرہ انتشار کی نذر ہوا تو آمرانہ مزاج رکھنے والے افراد نے اُس موقع کو غنیمت جان کر حالات کو اس حد تک بگاڑا کہ اُس کے لیے آمریت کی آغوش میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ روس میں اشتراکیت کو اسی خلفشار کے اندر غلبہ حاصل ہوا۔ چین میں افراتفری کی فضا نے اشتراکیت کے لیے راہ ہموار کی۔ اب حال ہی میں اٹلی کے اندر اشتراکیت کے حق میں جو انقلاب برپا ہوا ہے وہ بھی خلفشار کا ہی نتیجہ ہے۔ اِس بدنصیب ملک میں سب سے پہلے فکری انتشار پیدا ہوا اور اُس کے بعد زندگی کے سارے شعبے جنگل کی آگ کی طرح اُس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اِن صفحات میں اِس انتشار کا بھیانک نقشہ ساری تفصیلات کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم اِس کے چند گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ درج ذیل معلومات امریکہ کے مشہور جریدہ "نیوز ویک" (۲۶ / اپریل) سے اخذ کی گئی ہیں۔

"اِس خلفشار کے اسباب واضح ہیں۔ ملکی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ بے روزگاری بڑی سُرعت کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ملکی سکہ لیرا کی قدر و قیمت میں گذشتہ دو ماہ میں ۲۰ فیصد کمی ہوئی ہے، اور چونکہ ملکی پیداوار کا چوتھائی حصہ درآمدات پر خرچ ہو رہا ہے، اِس لیے افراطِ زر اور قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ بالکل یقینی ہے"۔

فاضل مقالہ نگار اِس انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہولناک جرائم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اطالوی باشندوں کے نزدیک معاشی بحران سے کہیں زیادہ (باقی اشارات بر صفحہ ۴۷)

ہجرتِ حبشہ

(۲)

مہاجرین کے ساتھ حبشہ میں سلوک ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ حبشہ قریش کی پرانی تجارت گاہ تھی جہاں وہ خوب رزق کماتے اور تجارت میں اچھے فائدے اٹھاتے تھے۔ اسی وجہ سے مہاجرین کو وہاں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ مہاجرین کا اپنا قول یہ ہے کہ ہم وہاں بہت اچھی طرح رہے، اپنے دین کے معاملہ میں پورے امن سے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے، کوئی اذیت ہم کو نہ دی جاتی تھی اور نہ کوئی بات ہمیں ایسی سننی پڑتی تھی جو ہمیں ناگوار ہو۔

قریش کا وفد ان کے پیچھے جاتا ہے قریش نے جب دیکھا کہ یہ لوگ حبشہ میں امن کے ساتھ ٹک گئے ہیں تو انھوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ نجاشی[۱] کے پاس (جس کا نام بخاری میں اَصحَمَہ لکھا ہے) بھیجا تاکہ انہیں واپس لائیں۔ لیکن نجاشی نے ان کی بات نہ مانی اور انہیں ناکام واپس کردیا۔ اس وفد کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں کے ساتھ عُمارہ بن ولید بن مُغیرہ کو بھی بھیجا گیا تھا۔ اور بعض میں یہ ہے کہ عمرو بن العاص تو پہلی اور دوسری ہجرت، دونوں کے موقع پر نجاشی کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر پہلے وفد میں ان کے ساتھ عمارہ تھا اور دوسرے وفد میں عبداللہ۔ مگر ابن اسحاق نے دونوں موقعوں پر عبداللہ ہی کا نام لیا ہے۔

مہاجرین کی واپسی اور اس کا سبب اسی سال رمضان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبر حبش میں مہاجرین کو اس شکل میں پہنچی کہ کفارِ مکہ مسلمان ہوگئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک میں؛

---

[۱] نجاشی (NEGUS) شاہانِ حبشہ کا لقب تھا۔

جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، یکایک تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان مبارک پر سورۂ نجم جاری فرما دی۔ کلام کی شدتِ تاثیر کا حال یہ تھا کہ جب آپ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اُس پر شور مچانے کا ہوش تک نہ رہا، اور خاتمہ پر جب آپ نے سجدہ فرمایا تو سب حاضرین سجدہ میں گر گئے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ "یہ قرآن مجید کی پہلی سورۃ تھی جسے حضورؐ نے قریش کے مجمع عام میں (اور ابن مَرْدُوْیَہ کی روایت کے مطابق حرم میں) سُنایا تھا۔ مجمع میں کافر مومن سب موجود تھے۔ آخر میں جب آپ نے آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک، جو مخالفت میں پیش پیش تھے سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے کفار میں سے صرف ایک شخص اُمیّہ بن خَلَف کو دیکھا کہ اُس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی اور کہا میرے لیے بس یہی کافی ہے۔" اس واقعہ کے دوسرے عینی شاہد حضرت مُطّلِبؓ بن ابی وَدَاعَہ ہیں جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نسائی اور مُسندِ احمد میں ان کا اپنا بیان یہ نقل ہوا ہے کہ "جب حضورؐ نے سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور سب حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا اور اسی کی تلافی اب میں اس طرح کرتا ہوں کہ اس سورہ کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔" ابن سعد نے واقدی کی سند سے بیان کیا ہے کہ ولید بن مُغیرہ نے بھی مٹھی بھر مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی پر لگائی تھی، کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ سجدہ نہ کر سکتا تھا، اور ابواُحَیحَہ سعید بن العاص نے بھی اسی طرح مٹی اپنی پیشانی پر لگائی تھی کیونکہ وہ بھی بوڑھا تھا۔

اِس سے یہ خبر مشہور ہو کر حبشہ تک اس شکل میں پہنچی کہ مشرکینِ قریش مسلمان ہو گئے ہیں۔ مگر اصل صورتِ حال دوسری ہی تھی۔ قرآن کی شدتِ تاثیر سے متاثر ہو کر سجدہ کرنے والے اُس وقت تو سجدہ کر بیٹھے مگر بعد میں انہیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہوگئی۔ اور لوگوں نے بھی اُن کو مطعون کرنا شروع کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سُننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے کان لگا کر سنا ہی نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سجدہ بھی کر لیا۔ آخرکار انہوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہم نے تو اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰی وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تھے کہ تلك الغرانقة العلی وان شفاعتهن لترتجی (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)، اس لیے ہم نے سمجھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے

طریقے پر آ گئے ہیں۔ حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ سورۂ نجم کے اِس سیاق و سباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہو سکتی ہے جن کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے حضورؐ کی زبان سے سُنے ہیں۔

قصۂ غرانیق کی حقیقت لیکن افسوس یہ ہے کہ خود ہمارے ہاں کے مفسرین و محدثین میں بعض ایسی روایات مشہور ہو گئیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کفار نے حضورؐ کی زبان مبارک سے جو فقرے سُننے کا دعویٰ کیا تھا وہ فی الواقع حضورؐ ہی کی زبان سے نکلے تھے، اور اس تمنا کی وجہ سے نکلے تھے کہ کسی طرح آپؐ کے اور کفار کے درمیان منافرت دُور ہو، اور شیطان نے آپ کی اِس تمنا سے فائدہ اُٹھا کر یہ کلمات آپ کی زبان پر جاری کرا دیے تھے۔

قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش قرآن میں کوئی ایسی بات نازل ہو جائے جس سے اسلام کے خلاف کفارِ قریش کی نفرت دُور ہو اور وہ کچھ قریب آ جائیں۔ یا کم از کم ان کے دین کے خلاف ایسی سخت تنقید نہ ہو جو انہیں بھڑکا دینے والی ہو۔ یہ تمنا آپ کے دل ہی میں تھی کہ ایک روز قریش کی ایک بڑی مجلس میں بیٹھے ہوئے آپؐ پر سورۂ نجم نازل ہوئی اور آپ نے اُسے پڑھنا شروع کیا۔ جب آپ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى پر پہنچے تو یکایک آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، تلك الغرانقة العلی وان شفاعتھن لترتجی (یہ بلند دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)۔ اس سے آگے پھر آپ سورۂ نجم کی آیات پڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اختتام سورۃ پر آپ نے سجدہ کیا تو مشرک اور مسلمان سب سجدے میں گر گئے۔ کفارِ قریش نے کہا کہ اب ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کیا اختلاف باقی رہ گیا۔ ہم بھی تو یہی کہتے تھے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے، البتہ ہمارے یہ معبود اس کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں۔ شام کو جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ دونوں فقرے تو میں نہیں لایا تھا۔ اس پر آپ سخت مغموم ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی جو سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں ہے[1] کہ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

---

[1] ایک مغربی مستشرق نے کمال بد دیانتی کے ساتھ یہ بات اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دی ہے کہ "وہ شیطانی آیتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ سورۂ نجم کی آیات ۲۱ تا ۲۴ نازل کر دیں"۔ حالانکہ یہ قطعی بلا ثبوت بات ہے جس کے لیے کوئی حوالہ نہ اس مصنف نے دیا ہے، نہ وہ دے سکتا ہے۔

لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ .... ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا۔ یعنی "اے نبیؐ، ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو .... پھر ہمارے مقابلہ میں تم کوئی مددگار نہ پاتے"۔ یہ چیز برابر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و غم میں مبتلا کیے رہی یہاں تک کہ سورۂ حج کی آیت ۵۲ نازل ہوئی جس میں آنحضرتؐ کو تسلی دی گئی کہ تم سے پہلے بھی انبیاء کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کسی نبی نے کوئی تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اُدھر یہ واقعہ کہ قرآن سن کر آنحضرتؐ کے ساتھ قریش کے لوگوں نے بھی سجدہ کیا، مہاجرین حبشہ تک اس رنگ میں پہنچا کہ آنحضرتؐ اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ صلح کی خبر غلط تھی، اسلام اور کفر کی دشمنی جوں کی توں قائم ہے۔

یہ قصہ ابن جریر اور بہت سے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں، ابن سعد نے طبقات میں، الواحدی نے اسباب النزول میں، موسیٰ بن عُقبہ نے مغازی میں، ابن اسحاق نے سیرت میں اور ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بزّار، ابن مردُویہ اور طبرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ جن سندوں سے یہ نقل ہوا ہے وہ محمد بن قیس، محمد بن کعب قرظی، عُروہ بن زبیر، ابو صالح، ابو العالیہ، سعید بن جُبیر، ضحاک، ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قتادہ، مجاہد، سُدّی، ابن شہاب زُہری، اور ابن عباسؓ پر ختم ہوتی ہیں (ابن عباسؓ کے سوا ان میں سے کوئی صحابی نہیں ہے)۔ قصے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں۔ ایک یہ کہ بتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ ہم نے اُن کا استقصاد کرنے کی کوشش کی تو ۱۵ عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔ دوسرا بڑا اختلاف یہ ہے کہ کسی روایت کی رو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپ پر القاء کر دیے اور آپ سمجھے کہ یہ بھی جبریل لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اُس خواہش کے زیرِ اثر سہواً آپ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اُس وقت آپ کو اونگھ آ گئی تھی اور اس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپ نے یہ قصداً کہے مگر استفہام انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے اور سمجھا یہ گیا کہ آپ نے کہے ہیں۔ اور کسی کے

نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی شخص تھا۔

ابن کثیر، بیہقی، قاضی عیاض، ابن خزیمہ، قاضی ابوبکر ابن العربی، امام رازی، قرطبی، بدر الدین عینی، شوکانی، آلوسی وغیرہ حضرات اس قصے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ "جتنی سندوں سے یہ روایت ہوا ہے، سب مُرسَل اور مُنقطع ہیں، مجھے کسی صحیح متّصل سند سے یہ نہیں ملا"۔ بیہقی کہتے ہیں کہ "از روئے نقل یہ قصہ ثابت نہیں ہے"۔ ابن خزیمہ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ "یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے"۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ "اس کی کمزوری اسی سے ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے کسی نے بھی اس کو اپنے ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح متصل بے عیب سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے منقول ہوا ہے"۔ امام رازی، قاضی ابوبکر اور آلوسی نے اس پر مفصل بحث کرکے اسے بڑے پر زور طریقے سے رد کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث، اور ابوبکر جصاص جیسے نامور فقیہ، اور زمخشری جیسے عقلیت پسند مفسر، اور ابن جریر جیسے امام تفسیر و تاریخ و فقہ اس کو صحیح مانتے ہیں اور اسی کو سورۂ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ ابن حجر کا محدثانہ استدلال یہ ہے کہ

"سعید بن جبیر کے طریق کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا مُنقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ بریں یہ ایک طریق سے متصلاً بسند صحیح بھی نقل ہوا ہے جسے بزّار نے نکالا ہے (مراد ہے یوسف بن حمّاد عن اُمیّہ بن خالد عن شعبہ عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس) اور دو طریقوں سے یہ اگرچہ مرسل ہے مگر اس کے راوی صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں۔ یہ دونوں روایتیں طبری نے نقل کی ہیں۔ ایک بطریق یونس بن یزید عن ابن شہاب۔ دوسری بطریق مُعتمر بن سلیمان و حمّاد بن سلمہ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی العالیہ"۔

جہاں تک موافقین کا تعلق ہے، وہ تو اسے صحیح مان ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین نے بھی بالعموم اس پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ایک گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس کی سند اس کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر سند قوی ہوتی تو یہ حضرات اس قصے کو مان لیتے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس سے تو سارا دین ہی مشتبہ ہوا جاتا ہے اور دین کی ہر بات کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے کہ نہ معلوم اور کہاں کہاں شیطانی اغوا یا نفسانی آمیزشوں کا دخل ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نوعیت کا استدلال

اُن لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو ایمان لانے کے عزم پر قائم ہوں، مگر دوسرے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا ہیں یا جواب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، ان کے دل میں تو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جن جن چیزوں سے یہ دین مشتبہ قرار پاتا ہو انہیں رد کر دیں۔ وہ تو کہیں گے کہ جب کم از کم ایک نامور صحابی اور بکثرت تابعین و تبع تابعین، اور متعدد و معتبر راویانِ حدیث کی روایات سے ایک واقعہ ثابت ہو رہا ہے تو اسے صرف اس بنا پر رد کر دیا جائے کہ اُن سے آپ کا دین مشتبہ ہوا جاتا ہے؟ اس کے بجائے آپ کے دین کو مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے جبکہ یہ واقعہ اسے مشتبہ ثابت کر رہا ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ تنقید کا وہ صحیح طریقہ کیا ہے جس سے اگر اس قصے کو پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ ناقابل قبول قرار پاتا ہے، چاہے اس کی سند کتنی ہی قوی ہو، یا قوی ہوتی۔

پہلی چیز خود اُس کی اندرونی شہادت ہے جو اُسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا جب ہجرتِ حبشہ اُولیٰ واقع ہو چکی تھی اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرین میں سے ایک گروہ مکہ واپس آ گیا۔ اب ذرا تاریخوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔

——— ہجرتِ حبشہ معتبر تاریخی روایتوں کی رُو سے رجب ۵ھ بعدِ بعثت میں واقع ہوئی اور مہاجرین حبشہ کا ایک گروہ مصالحت کی غلط خبر سُن کر تین مہینے بعد (یعنی اُسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکے واپس آ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ھ بعدِ بعثت کا ہے۔

——— سورۂ بنی اسرائیل جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فعل پر بطورِ عتاب نازل ہوئی تھی، معراج کے بعد اُتری ہے اور معراج کا زمانہ معتبر ترین روایات کی رو سے ۱۱ھ یا ۱۲ھ بعدِ بعثت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گزر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

——— اور سورۂ حج کی آیت ۵۲، جیسا کہ اس کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے، ۱ھ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گزر لیے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو القائے شیطانی سے ہو گئی تھی، اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔

کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد، اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان نو سال بعد؟

پھر اس قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سورۂ نجم میں ہوئی تھی اور اس طرح ہوئی کہ ابتداء سے آپ اصل سورہ کے الفاظ پڑھتے چلے آ رہے تھے، یکایک مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچ کر آپ نے بطور خود یا شیطانی اغوا سے یہ فقرہ ملایا، اور آگے پھر سورۂ نجم کی اصل آیات پڑھتے چلے گئے۔ اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کفار مکہ اسے سن کر خوش ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ اب ہمارا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اختلاف ختم ہو گیا۔ مگر سورۂ نجم کے سلسلۂ کلام میں ذرا اس الحاقی فقرے کو شامل کر کے تو دیکھیے:۔

"پھر تم نے کچھ غور بھی کیا ان لات اور عزّٰی پر اور تیسری ایک اور (دیوی) مناۃ پر؟ ~~یہ بلند پایہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے~~۔ کیا تمہارے لیے تو ہوں بیٹے اور اس (یعنی اللہ) کے لیے ہوں بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے صحیح رہنمائی آ گئی ہے۔"

دیکھیے اس عبارت میں خط کشیدہ فقرے نے کیسا صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک سانس میں کہا جاتا ہے کہ واقعی تمہاری یہ دیویاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ دوسرے ہی سانس میں پلٹ کر ان پر سپوٹ کی جاتی ہے کہ بے وقوفو، یہ تم نے خدا کے لیے بیٹیاں کیسی تجویز کر رکھی ہیں؟ اچھی دھاندلی ہے کہ تمہیں تو ملیں بیٹے اور خدا کے حصے میں آئیں بیٹیاں۔ یہ سب تمہاری من گھڑت ہے جسے خدا کی طرف سے کوئی سندِ اعتبار حاصل نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو جانے دیجیے کہ یہ صریح بے تکی باتیں کسی مردِ عاقل کی زبان سے نکل بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ مان لیجیے کہ شیطان نے غلبہ پا کر یہ الفاظ زبان سے نکلوا دیے تھے۔ مگر کیا قریش کا وہ سارا مجمع جو اسے سن رہا تھا، بالکل ہی پاگل ہو گیا تھا کہ بعد کے فقروں میں ان تعریفی کلمات کی کھلی کھلی تردید سن کر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ ہماری دیویوں کی واقعی تعریف کی گئی ہے؟ سورۂ نجم کے آخر تک کا پورا مضمون اس ایک تعریفی فقرے کے بالکل خلاف ہے۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ اسے آخر تک سننے کے بعد یہ پکار اٹھے ہوں گے کہ چلو آج ہمارا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اختلاف ختم ہو گیا ہے؟

یہ تو ہے اس فقرے کی اندرونی شہادت جو اس کے سراسر لغو اور مہمل ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔

اس کے بعد دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں تین آیتوں کی جو شانِ نزول بیان کی جا رہی ہے آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصے میں بیان یہ کیا جا رہا ہے کہ آمیزش سورۂ نجم میں کی گئی تھی، جو ۵ بعد بعثت میں نازل ہوئی۔ اس آمیزش پر سورۂ بنی اسرائیل والی آیت میں عتاب فرمایا گیا، اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعہ کی توجیہ سورۂ حج کی آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت پیش آئی ہوگی۔ یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جب آمیزش کا واقعہ پیش آیا، یا پھر عتاب والی آیت سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورۂ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورۂ نجم ہی میں نہ شامل کی گئیں بلکہ عتاب والی آیت کو چھ سال تک یوں ہی ڈالے رکھا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل جب نازل ہوئی تب کہیں اس میں لاکر چسپاں کر دیا گیا۔ پھر تنسیخ والی آیت مزید دو ڈھائی سال تک پڑی رہی اور سورۂ حج کے نزول تک اسے کہیں چسپاں نہ کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی سورت میں اور کسی کو کسی دوسری سورت میں ٹانک دیا جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعہ کے چھ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی تو علاوہ اس بے تکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے؟

یہاں پہنچ کر نقدِ صحیح کا تیسرا قاعدہ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی یہ کہ کسی آیت کی جو تفسیر بیان کی جا رہی ہو اسے دیکھا جائے کہ آیا قرآن کا سیاق و سباق بھی اسے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آٹھواں رکوع پڑھ کر دیکھیے اور اس سے پہلے اور بعد کے مضمون پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ اس سلسلۂ کلام میں آخر کیا موقع اس بات کا نظر آتا ہے کہ چھ سال پہلے کے ایک واقعہ پر نبی کو ڈانٹ بتائی جائے (قطع نظر اس سے کہ آیت وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ میں نبی پر کوئی ڈانٹ ہے بھی یا نہیں اور آیت کے الفاظ کفار کے فتنے میں نبی کے مبتلا ہو جانے کی تردید کر رہے ہیں یا تصدیق)؟ اسی طرح سورۂ حج پڑھ کر دیکھیے۔ آیت ۵۲ سے پہلے کا مضمون بھی پڑھیے اور بعد کا بھی دیکھیے۔ کیا کوئی معقول وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ اس سیاق و سباق میں یکایک یہ مضمون کیسے آ گیا کہ "اے نبی ۹ سال پہلے قرآن میں آمیزش کر بیٹھنے کی جو حرکت تم سے ہو گئی تھی اس پر گھبراؤ نہیں، پہلے انبیا سے بھی شیطان یہ حرکتیں کراتا رہا ہے، اور جب کبھی انبیا اس طرح کا فعل کر جاتے ہیں تو اللہ اس کو منسوخ کر کے اپنی آیات کو پھر پختہ کر دیتا ہے۔"

ہم اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت، خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب کہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب، ہر چیز اُسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک مُتشکِّک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصّہ قطعی غلط ہے۔ رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا جب کہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہشِ نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضورؐ کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے، یا آپ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرما بیٹھیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں، یا یہ کہ آپ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مشتبہ طریقے سے آتی تھی کہ جبریل کے ساتھ شیطان بھی آپ پر کوئی لفظ اِلقا کر جائے اور آپ اس غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبریل ہی لائے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے اور اُن ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ اس روایت پرستی سے جو محض سند کا اتّصال یا راویوں کی ثقاہت یا طُرُقِ روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اُس شک کو بھی دُور کر دیا جائے جو راویانِ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کو اس قصے کی روایت میں مبتلا ہوتے دیکھ کر دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ اگر اس قصے کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے تو نبیؐ اور قرآن پر اتنا بڑا اِبہتان حدیث کے اتنے راویوں کے ذریعے سے جن میں بعض بڑے نامور ثقہ بزرگ ہیں، اشاعت کیسے پا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ ہم کو خود حدیث کے ذخیرے میں مل جاتا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں اصل واقعہ اس طرح آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور خاتمے پر جب آپ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین، مسلم اور مشرک سب، سجدے میں گر گئے۔ واقعہ بس اتنا ہی تھا۔ اور یہ

کوئی تعجب کی بات نہ تھی - اوّل تو قرآن کا زورِ کلام اور انتہائی پُرتاثیر اندازِ بیان، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کا ایک مُلہمانہ شان کے ساتھ ادا ہونا، اس کو سُن کر اگر پورے مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہو، اور آپ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے - یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادوگر ہے - البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تاثر پر کچھ پشیمان سے ہوئے ہوں گے اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اِس فعل کی یہ توجیہ کی ہوگی کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سُنے تھے اس لیے ہم بھی اُن کے ساتھ سجدے میں گر گئے[1] دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرینِ حبشہ تک اس شکل میں پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح ہوگئی ہے کیونکہ دیکھنے والوں نے آپ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا - یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرین سب یا ان میں سے اکثر مکے واپس آگئے - ایک صدی کے اندر یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اس سجدے کی یہ توجیہ، اور مہاجرین حبشہ کی واپسی، مل جل کر ایک قصے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض ثقہ لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہوگئے - انسان آخر انسان ہے - بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسا اوقات لغزش ہو جاتی ہے اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے - عقیدت میں بے جا غلو رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں - اور بدطینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انہیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ سب کچھ جو اُن کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، نذرِ آتش کر دینے کے لائق ہے -

واپس آنے والے مہاجرین پر کیا گذری

اہلِ مکہ کے مسلمان ہونے کی خبر سُن کر شوال ۵ھ بعد بعثت میں مہاجرین حبشہ سے مکہ کی طرف واپس ہوگئے - ابن سعد کا بیان ہے کہ سب واپس آگئے، اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بعض

[1] یاقوت نے مُعجم البُلدان میں لفظ عزّیٰ کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ قریش کے لوگ کعبے کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: واللات والعزّیٰ، ومنٰوۃ الثالثۃ الاخریٰ، فانھن الغرانیق العُلیٰ، وان شفاعتھن لَتُرتجیٰ - اس سے یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی زبان سے لات و عزیٰ کا ذکر سنتے ہی کسی شخص نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے ہوں اور دُور سے سُننے والوں کو اس سے غلط فہمی لاحق ہوتی ہو -

وہیں ٹھہرے رہے۔ بلاذُری نے نہ صرف یہ کہ پہلی ہجرتِ حَبَشہ کے تمام مہاجرین کی واپسی کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُن کی پوری فہرست دے کر یہ بھی بتایا ہے کہ کون کس کی پناہ میں داخل ہوا۔ مکہ کے قریب پہنچے تو بنی کنانہ کا ایک شخص ملا جس سے انہوں نے قریش کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے معبودوں کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا تو لوگ ان کے ساتھ ہوگئے، پھر وہ ان کے معبودوں کی حسبِ سابق بُرائی کرنے لگے تو لوگ بھی پہلے کی طرح ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگے، اور ہم نے اِسی حال پر ان کو چھوڑا ہے"۔ اس پر مہاجرین نے باہم مشورہ کیا کہ حبش کی طرف پلٹ جائیں یا اب واپس آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ مکہ میں داخل ہو جائیں؟ پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہوا، سوائے ابن مسعودؓ کے کہ وہ بلا جِوار داخل ہوئے اور کچھ مدت ٹھہر کر حبش واپس چلے گئے۔ ابن مسعودؓ کے متعلق یہ بات ابن سعد اور بلاذری اور بعض دوسرے لوگوں نے لکھی ہے، مگر ابن القیّم نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ مکہ ہی میں ٹھہرے رہے، اور ابن اسحاق کا یہ قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ وہ اس ہجرت میں گئے ہی نہ تھے۔

بلاذُری نے تفصیل بیان کی ہے کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت واپس آنے والے مہاجرین میں سے کس نے قریش کے سرداروں میں سے کس کی پناہ حاصل کی تھی:۔

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفّان	کو پناہ دینے والا	ابو اُحَیحہ سعید بن العاص
۲۔ حضرت ابو حُذَیفہؓ بن عُتبہ بن ربیعہ	"	اُمیّہ بن خَلَف
۳۔ حضرت زبیرؓ بن العوّام	"	زَمعہ بن الاسود
۴۔ حضرت مُصعَبؓ بن عُمیر	"	نضر بن الحارث بن کَلَدہ (یا ابو عَزیز بن عُمیر)
۵۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عَوف	"	اَسود بن عبد یَغوث
۶۔ حضرت عامرؓ بن رَبیعہ	"	عاص بن وائل سَہمی
۷۔ حضرت ابو سَبرہؓ بن ابی رُہم	"	اَخنَس بن شَریق
۸۔ حضرت حاطبؓ بن عمرو	"	حُوَیطِب بن عبد العزّیٰ
۹۔ حضرت سُہَیلؓ بن بَیضاء	"	اُن کے قبیلے کا کوئی شخص (اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ کچھ دن مکے میں چھپے رہے، پھر حبش واپس چلے گئے)۔

بلاذُری نے واقدی کے حوالہ سے، اور کچھ اختلافات کے ساتھ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مَظعون نے وَلید بن مُغیرہ کی پناہ لی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمانوں پر سخت

ظلم ہو رہے ہیں اور وہ ولید کی پناہ میں آرام سے چل پھر رہے ہیں تو انہیں اس پر شرم محسوس ہوئی اور وہ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ میرا ایک مشرک کی پناہ میں رہنا، جبکہ میرے ساتھی اہلِ دین مصائب میں مبتلا ہیں، میرے نفس کی بڑی کمزوری ہے۔ چنانچہ ولید کے پاس جا کر انہوں نے کہا "آپ مجھے اپنی پناہ سے بری کر دیجیے۔" اس نے کہا "بیٹا، کیا تم نے میری پناہ میں بھلائی کے سوا کچھ اور دیکھا ہے؟ کیا کسی نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے اس کے جواب میں کوئی شکایت نہیں بیان کی، بس یہ کہا کہ "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس کے سوا کسی دوسرے کی پناہ میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔" ولید نے کہا "تو پھر حرم میں چل کر اسی طرح میری پناہ سے براءت کا اعلان کرو جس طرح میں نے اپنی پناہ کا اعلان کیا تھا۔" حضرت عثمانؓ بخوشی اس کے لیے تیار ہو گئے۔ ولید اور وہ ایک ساتھ حرم میں گئے۔ ولید نے کہا "یہ عثمان میری پناہ واپس کرنے کے لیے آئے ہیں۔" حضرت عثمانؓ نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں نے ولید کی پناہ کو ایک شریف اور باوفا آدمی کی پناہ پایا ہے۔ مگر میں اب اللہ کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا، اس لیے ان کی پناہ میں نے واپس کر دی ہے۔" اسی زمانے میں عرب کا مشہور شاعر لبید بن ربیعہ مکہ آیا اور اپنے اشعار سناتے ہوئے اس نے یہ مصرع پڑھا:

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل

خبردار رہو، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے

حضرت عثمانؓ بن مظعون پکار اٹھے، "تم نے سچ کہا" ۔ پھر اس نے جب دوسرا مصرع پڑھا۔

وکل نعیم لا محالۃ زائل

اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے

تو انہوں نے کہا: "یہ جھوٹی بات ہے، جنت کی نعمت زائل ہونے والی نہیں ہے۔" لبید اس پر بگڑ بیٹھا اور قریش کے لوگوں سے کہنے لگا، "خدا کی قسم، آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی موجب ننگ و عار نہیں ہوا ہے، اور نہ بدتمیزی آپ لوگوں کی شان رہی ہے۔" اس پر بنی مُغیرہ میں سے ایک شخص نے اٹھ کر حضرت عثمان کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا جس سے ان کی آنکھ نیلی ہو گئی۔ ولید نے طنز کے انداز میں ہنس کر ان سے کہا "بیٹے، اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟" انہوں نے جواب دیا "میری دوسری آنکھ بھی اسی چوٹ کی محتاج ہے جو اس کی ساتھی کو لگی ہے۔" ولید نے کہا "تم ایسے ذمہ میں تھے جو تمہاری حفاظت کرنے والا تھا۔" انہوں نے کہا

"خدا کی قسم، اب میں اللہ کی پناہ کے سوا اور کسی کی پناہ نہ چاہوں گا۔" اسی گفتگو کے دوران میں عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ نے اُس شخص کی ناک توڑ دی جس نے حضرت عثمانؓ بن مظعون کو تھپڑ مارا تھا۔

ابن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت ابوسلمہؓ نے اپنے ماموں ابوطالب کی پناہ لی، کیونکہ وہ اُن کی بہن بَرّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ اس پر بنی مخزوم نے جاکر ابوطالب سے کہا "اپنے بھتیجے کو تو آپ نے اپنی پناہ میں لے رکھا ہے، مگر ہمارے آدمی سے آپ کا کیا واسطہ کہ اُسے آپ پناہ دے رہے ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا بھتیجا ہے تو ابوسلمہ میرا بھانجا ہے۔ اگر میں اپنے بھتیجے کو پناہ دے سکتا ہوں تو اپنے بھانجے کو کیوں نہیں دے سکتا"؟ بنی مخزوم نے کچھ جھگڑا کرنا چاہا تو ابولہب نے اُٹھ کر کہا کہ "اے اہل قریش، تم نے شیخ کے ساتھ بہت کچھ کر لیا، اور تم برابر اُن پر دباؤ ڈالتے چلے جا رہے ہو کہ اپنی قوم میں جس کو وہ پناہ دیں اس کو ان کی پناہ سے نکالو۔ خدا کی قسم، یا تو تم ان کو تنگ کرنے سے باز آجاؤ، نہیں تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔" بنی مخزوم ابولہب کی یہ بات سُن کر گھبرا گئے اور انہوں نے کہا اے ابوعُتبہ، ہم تم کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

طبری نے لکھا ہے کہ واپس آنے والوں میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان اور ان کی بیوی حضرت رُقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابوحذیفہؓ اور ان کی بیوی سہلہؓ بنت سُہیل بن عمرو مکہ ہی میں رہ گئے اور مدینہ کی ہجرت تک وہیں مقیم رہے۔ لیکن یہ بیان مشتبہ ہے، کیونکہ ابن اسحاق نے دوسری ہجرت حبشہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام ۳۳ مردوں اور آٹھ عورتوں کی اُس جماعت میں بھی شامل کیا ہے جو حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے حبش سے مکہ آئے تھے، جن میں سے دو کا انتقال ہو گیا، سات قید کر لیے گئے اور ۲۴ نے جنگ بدر میں حصہ لیا۔ (باقی)

تکمیلِ اصول و فروع

سید ریاض الحسن صاحب ایڈووکیٹ و سکرٹری لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن

جو لوگ سیاست کو شریعت کی نگرانی اور راہ نمائی سے الگ کر کے آزادہ روی اور اباحت اختیار کر لیتے ہیں ان کی مذمت کرتے ہوئے حافظ سخاویؒ کہتے ہیں:

ومن اعظم خطأ السلاطین والامراء نظرھم فی سیاسات متقدمیھم وعملھم بمقتضاھا غیر نظر فیما ورد بہ الشرع ثم تسمیۃ افعالھم الخارجۃ عن الشرع سیاسۃ فان الشرع ھو السیاسۃ لاعمل السلطان بھواہ ورأیہ ووجہ خطئھم فی ھذا ان مضمون قولھم یقتضی ان الشرع لم یرد بما یکفی فی السیاسۃ فاحتجنا الی تتمۃ فیما رأیناہ فھم یقتلون من لا یجوز قتلہ ویفعلون مالا یحل فعلہ ویسمون ذلک سیاسۃ وھذا تغالط علی الشریعۃ یشبہ المراغمۃ وھو قریب من انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارھم مقتدون۔

"بادشاہوں اور امراء کی عظیم ترین غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شریعت کو نظر انداز کر کے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے بادشاہوں اور امراء کی سیاسیات کو دیکھتے اور ان کے مقتضاء کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنے اِن شریعت سے خارج کاموں کو سیاست کا نام دیتے ہیں حالانکہ شریعت ہی سیاست ہے نہ کہ بادشاہ کا وہ عمل جو اس کی اپنی خواہش اور رائے پر مبنی ہو۔ ان کی اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایسا کہنے سے یہ بات لازم آتی ہے کہ شریعت ہمارے سیاسی کاموں کے لیے کافی نہیں ہے اور اس کو

تکمیل کرنے کے لیے ہماری رائے کا دخل ضروری ہے۔ اسی لیے وہ ایسے قتل کرتے ہیں جو ناجائز ہوتے ہیں اور ایسے فعل کرتے ہیں جو حلال نہیں ہوتے اور اسے سیاست کا نام دیتے ہیں۔ یہ شریعت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے اور ایسا ہی ہے جیسے یوں کہا جائے کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو جو کرتے دیکھا ہے اس پر گامزن ہیں۔" (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۴۸)

یہ کہنا کہ شریعت نے صرف کلیات و اصول بیان کیے ہیں اور جزئیات و فروع کو حالات و زمانہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور یہ کہ اگر جزئیات بھی بیان کر دی جاتیں تو شریعت ہر عہد و محل کے لیے قابل عمل نہ رہتی، اسلام پر ایک بہت بڑا حملہ ہے اور اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے مترادف ہے۔ بالعموم اس عقیدہ کے حامل افراد سنتِ رسول کو شریعت سازی کا جزوِ لاینفک تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ زیادہ تر تفصیلات و جزئیات کا ماخذ سنت ہے۔

اگر تفصیلات و جزئیات کو شریعت سے الگ کر دیا جائے اور صرف اصول اپنا لیے جائیں تو شریعت صرف ایک معاشرے کے لیے بھی قابلِ عمل نہیں رہتی۔ وہ افراد کے ہاتھوں محض کھلونا بن کر رہ جائے گی۔ اس خیال کے لوگ ہر بات کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال کر فتنہ و فساد برپا کر دیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ معاشرہ مختلف روش اختیار کر سکے گا اور کسی ایک کو بھی غلط یا صحیح کہنا ممکن نہیں ہوگا۔ مثلاً قرآن نے جمعہ کی نماز کی طرف بلائے جانے کا اصول ذکر کر دیا: إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَّوْمِ الْجُمُعَةِ "جب جمعہ کی نماز کے لیے تمہیں پکارا جائے"۔ اب پکارنے کا طریق کار پوری تفصیل سے اذان کی صورت میں اگر بیان نہ کر دیا جائے تو ہر بستی کے لوگ مختلف آرا قائم کر سکتے ہیں۔ کوئی کہے گا کہ سائرن بجایا جائے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ لاؤڈ سپیکر پر آواز دینا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا ہی معاملہ وراثت کا بھی ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس بات کی بین شہادت دیتا ہے کہ جو بھی مصلح کسی قوم میں پیدا ہوا اور اس نے اپنے معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی اس نے اپنے آپ کو اگر صرف اصولوں تک محدود رکھا تو وہ کامیاب نہیں ہوا یا بہت تھوڑی حد تک کامیاب ہو سکا۔ البتہ جن مصلحین نے جزئیات بھی وضع کر دیں وہ معاشرے کو نہ صرف خاطر خواہ حد تک بدلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ ان کی لائی ہوئی تبدیلیاں صدیوں تک اثر پذیر رہیں۔ رالف لنٹن (RALPH LINTON) لکھتا ہے:

"جو لیڈر ایک نیا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لیے سب سے مشکل بات یہ ہوتی ہے کہ

اسے اُن لوگوں میں کام شروع کرنا پڑتا ہے جو ایک اور قسم کی سوسائٹی کے طرزِ زندگی کی ٹریننگ لے چکے ہوتے ہیں۔ یہ ٹریننگ پیدائش سے شروع ہوتی ہے اور ایک آدمی بالغ ہونے تک غیر شعوری طور پر اس سوسائٹی کے عادات واطوار اپنا چکا ہوتا ہے۔ یہ عادات واطوار بدلے جا سکتے ہیں اگر ایک آدمی کسی دوسری سوسائٹی میں زندگی بسر کرنا شروع کر دے اور رفتہ رفتہ اس میں جذب ہو جائے۔ لیکن یہ تبدیلی اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک نئی سوسائٹی نووارد کے سامنے ایسے نمونہ جاتِ عمل (PATTERNS OF BEHERIM) نہ پیش کرے جن کو وہ براہ راست اور خارجی طور پر (ذاتی رائے کو دخل دیے بغیر) سیکھ سکے۔ جب نئی سوسائٹی میں ایسے نمونہ ہائے عمل کی کمی ہوتی ہے تو ہر شخص کو ہر دفعہ کوئی فعل سرانجام دینے سے پہلے رُکنا پڑتا ہے اور خود سوچ بچار کرنی پڑتی ہے اور پھر جو بات ایک شخص کے خیال میں نئی سوسائٹی کے بنیادی تصورات و عقائد کے مطابق ہوگی دوسرا شخص اس سے مختلف رائے کا مالک ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مختتم سلسلہ ابہام اور غیر ارادی طور پر دخل اندازی شروع ہو جاتی ہے اور جو لوگ ایک نیا معاشرہ جنم دینے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تھوڑے سے عرصہ کے بعد وہی پرانے عادات[1] واطوار اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال مذہبی فرقوں کی تاریخ میں بارہا دیکھی گئی ہے۔ ایسے فرقوں کے پاس بالعموم تصورات وافکار کا بڑا واضح مجموعہ ہوتا ہے اور ان کے افراد کے مابین بہت مضبوط جذبۂ اتحاد بھی ہوتا ہے۔ لیکن نظریات وافکار کا اظہار (تفصیلی و جزئی نمونہ جاتِ عمل کی صورت میں) خارج میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سوسائٹی کے عادات واطوار کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس سے اس فرقے کے زیادہ پیرو تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی عادات واطوار کی نئے عقائد کی روشنی میں تشریح وتاویل کی گنجائش ہوتی ہے اس لیے اس ساری کارروائی کے دوران ان عادات واطوار میں بہت معمولی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔

کامیاب معاشرتی انقلاب صرف اسی صورت میں برپا ہوتے ہیں جہاں نئے معاشرے کے نقشہ میں جزئیات وتفصیلات کی بہت بڑی مقدار خارجی طور پر موجود تھی۔ ایسے ضوابط کے مجموعہ کا حصول ایسے فرقے کے لیے ممکن العمل ہوتا ہے جن کا بانی اور اس کے بلافصل جانشین معاشرے پر مکمل اختیارات کے مالک ہوں۔ احوال وواقعات کی نئی نئی صورتیں پیغمبرؐ کے سامنے آتی ہیں اور جو صورتِ عمل وہ ہر معاملے

---

[1] یہ الفاظ لکھتے وقت اس کے ذہن میں غالباً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال تھی مگر تعصب (باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۵)

میں وضع کرتا ہے۔ وہ آئندہ کے لیے ایسے ہی معاملات کے لیے نظیر (PRECEDENT) بن جاتی ہے۔ بالآخر وہ نظائر اتنی بھاری مقدار میں جمع ہوجاتے ہیں کہ انسانی افراد کا کوئی بھی گروہ ان کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی بسر کرسکتا ہے اور نئے شامل ہونے والے افراد (OBJECTIVELY) خارجی طور پر (اپنی رائے اور خواہش کو شامل کیے بغیر) نئے افعال و عادات کو سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً کنفیوشس نے افراد کے باہمی معاملات کو بہت اہمیت دی اور اس کے لیے اپنے سسٹم میں قواعد و ضوابط کی بہت بڑی مقدار کو شامل کیا۔ وہ صرف نظریات و اقدار پر مشتمل ضابطہ حیات کا ڈھانچہ مرتب کرنے پر قانع نہیں رہا بلکہ اس نے ان نظریات و اقدار پر مبنی واقعی (CONCRETE) صورتیں بھی وضع کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چینی معاشرے پر دو ہزار سال سے زیادہ عرصے کے لیے نہایت کامیابی سے اثر انداز رہا۔"

(مطالعۂ انسان (STUDY OF MAN - 96, 97)

یہ اقتباس ریلف لنٹن کی ذاتی رائے نہیں اور نہ یہ اس کا ایک فلسفیانہ نظریہ ہے بلکہ یہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے جو اس نے بنی نوع انسان کے سینکڑوں معاشروں کے سائنٹفک تجزیہ و استقراء کے بعد بیان کی ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کا ریکارڈ جو سنت و آثار کی شکل میں محدثین نے محفوظ کیا ہے کس قدر قیمتی ہے: علامہ اقبال نے بالکل درست فرمایا ہے کہ محدثین کا یہ کام اسلام کی عظیم خدمت ہے۔ دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو لوگ شریعت کی بنیادیں اس گراں قدر سرمایہ کے بغیر قائم کرنے کی وکالت کرتے ہیں وہ یا اسلام کے بہت ہی نادان دوست ہیں یا سخت دشمن۔

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت نے صرف اصول بیان کیے ہیں اور تفصیلات کا ذکر نہیں کیا وہ اپنی دلیل میں کوئی مثال نہیں دے سکتے۔ آج تک کوئی شخص بھی کسی ایک صورت حال کی نشان دہی نہیں کرسکا جس کا لائحہ عمل شریعت نے تجویز نہ کیا ہو۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے علاوہ نکاح،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) کی وجہ سے وہ مکمل کر نہ کہہ سکا۔ کیونکہ ایسا اور کوئی پیغمبر نہیں ہوا جو خود اور اس کے بلافصل جانشین اپنے معاشرے پر حکمران تھے اور اس طرح ایک نیا معاشرہ تشکیل دے کر وہ ایک جامع و مکمل اور مفصل ضابطۂ حیات کا نمونہ مرتب کر گئے۔

طلاق، وراثت، اوقاف، بیع و شراء، شرکت و مضاربت، بیت المال کے ذرائع آمدنی اور اس کے مصارف، حاکم کے حقوق و فرائض، مسلم اور غیر مسلم (ذمی) شہری کے حقوق و فرائض، قتال، جرائم و عقوبات، غرضیکہ ایک آدمی کے پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک کسی بھی حالت میں اُسے جونسی صورتِ حال بھی پیش آسکتی ہے شریعت نے اُس کو ضرور اپنا موضوع بنایا ہے۔

اصول فقہ میں قیاس کو بالاتفاق اسلامی قانون کا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ فقہاء کے نزدیک کوئی مسئلہ ایسا در پیش نہیں آسکتا جس کی نظیر کتاب و سنت کے سرمایہ سے تلاش نہ کی جاسکتی ہو۔ جب ایک مجتہد قیاس سے کام لیتا ہے تو وہ صرف یہ معلوم کرتا ہے کہ اگر یہ معاملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آتا تو آپ کیا فرماتے۔ وہ اپنی ذاتی رائے پر ہرگز انحصار نہیں کرسکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود ہی ارشاد فرمادیا ہے جو دارمی نے ابوسلمہ سے روایت کیا ہے: آپؐ سے ان باتوں کی نسبت پوچھا گیا جو نئی نئی پیش آئیں گی تو فرمایا کہ علمائے وقت ان میں غور کریں گے۔" اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ شریعت کا عالم اگر غور کرے تو ہر نئی پیش آنے والی بات کی نظیر مل سکتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وبالجملة فعلى المؤمن ان يعلم ان النبي صلى الله عليه وسلم لم يترك شيئا يقرب الى الجنة الا وقد حدث به ولا شيئا يبعد عن النار الا وقد حدث به وان هذا السماع لو كان مصلحة شرعه الله ورسوله فان الله يقول (اليوم اكملت لكم دينكم) واذا وجد السامع به منفعة لقلبه ولم يجد شاهد ذلك من كتاب الله ولا من سنة رسوله لم يلتفت اليه اذا رأى قياسًا لا يشهد له الكتاب والسنة لم يلتفت اليه۔

"یعنی مومن کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی جو جنت کے قریب کرتی ہو اور آپؐ نے بیان نہ کردی ہو۔ اسی طرح کوئی ایسی بات بھی نہیں چھوڑی جو جہنم سے دُور کرتی ہو اور آپؐ نے بیان نہ کی ہو۔ اور اگر سماع میں کوئی مصلحت ہوتی تو اللہ اور اس کا رسولؐ ضرور اس کی اجازت دیتے کیونکہ اللہ نے کہا ہے "آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کردیا ہے"۔ جب سماع سننے والے کا دل اس کی طرف مائل ہو لیکن اسے اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت سے اس کے حق

ہیں کوئی دلیل نہ ملے اور نہ کوئی نظیر ہی دستیاب ہو تو اس سے گریز کرے"۔

(الرسالۃ فی السماع والرقص ۱۷۶)

اور "معارج الوصول" میں تو امام صاحب نے بہت شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے انہوں نے ایک باب کا نام ہی یہی رکھا ہے:

فصل فی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیّن الدین اصولہ وفروعہ، باطنہ وظاہرہ علمہ وعملہ فان ھذا الاصل ھو اصل اصول العلم والایمان وکل من کان اعظم اعتصاما بھذا الاصل کان اولی بالحق علماً وعملاً۔

(معارج الوصول ص ۱۸۱)

"باب اس بیان میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے اصول و فروع باطن و ظاہر، علم و عمل تمام بیان کر دیے ہیں اور بیشک یہی اصول علم و ایمان کی بنیاد ہے اور جس کسی نے جتنی زیادہ اس بنیاد سے وابستگی اختیار کی وہ اتنا ہی علمی اور عملی طور پر حق کے قریب رہا"۔

ہم اس کتاب میں سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں:

ولا نعلم مسألۃ واحدۃ اتفقوا علی انہ لا نص فیھا (ص ۱۱)

"اور ہم کسی ایسے مسئلے سے واقف نہیں ہیں جس کے بارے میں بالاتفاق یہ کہا جاتا ہو کہ اس کے بارے میں کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے"۔

واما العملیات وما تسمیہ الناس الفروع والشرع والفقہ فھذا قد بیّنہ الرسول احسن بیان فما شیئ مما امر اللہ او نھی عنہ اوحللہ اوحرمہ الا بیّن ذلک وقد قال اللہ تعالیٰ (الیوم اکملت لکم دینکم) وقال تعالیٰ (وما کان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شیئ وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون) وقال تعالیٰ (ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیئ وھدی ورحمۃ لقوم یومنون) وقال تعالیٰ (وما کان اللہ لیضل قوماً بعد اذ ھداھم حتی یُبیّنَ لھم ما یتقون) فقد بین للمسلمین جمیع ما یتقون کما قال (وقد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ) وقال تعالیٰ (فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول)

وهو الرد الى كتاب الله والى سنة الرسول بعد موته، وقوله (فان تنازعتم) شرط والفعل نكرة في سياق الشرط فاى شئ تنازعوا فيه ردوه الى الله والرسول ولو لم يكن بيان الله والرسول فاصلاً للنزاع لم يؤمروا بالرد اليه ۔ (ص ۱۹۴)

" اور عملیات جنہیں لوگ فروع، شریعت اور فقہ بھی کہتے ہیں، ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت اچھے طریقے سے بیان کر دیا ہے۔ پس کوئی شے ایسی نہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو یا اسے حلال کیا ہو یا حرام، اسے بیان نہ کر دیا گیا ہو۔ اللہ نے کہا ہے کہ "آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا ہے۔" اور فرمایا "کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔" اور " اتاری ہم نے آپ پر کتاب جس میں ہر چیز کا بیان ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت"۔ اور فرمایا: "اللہ ایسا نہیں ہے کہ گمراہ کرے کسی قوم کو بعد ہدایت دینے کے جب تک کہ وہ سب کچھ بیان نہ کر دے جس سے ان کو پرہیز گاری اختیار کرنی ہے"۔ پس مسلمانوں کے لیے وہ سب کچھ بیان کر دیا گیا جو متقی بننے کے لیے ضروری ہے، جیسا کہ فرمایا: "جو جو چیز تمہارے لیے حرام ہے اس کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے"۔ اور "اگر تمہارے مابین کسی چیز پر نزاع واقع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ"۔ اور یہ لوٹانا ہے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف اس کی وفات کے بعد۔ جملہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ" شرطیہ ہے اور شرط کے بعد فعل نکرہ ہے یعنی ہر وہ چیز جس کے بارے میں نزاع واقع ہو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ۔ اور اللہ اور رسول کا بیان نزاع کا فیصلہ نہیں کر سکتا تو اس کی طرف لوٹانے کا حکم ہی نہ دیا جاتا۔

واكثر المتاخرين الذين لم يعرفوا ذلك فطلبوا الحكم مما اعتقدوه من اجماع او قياس ومن قال من المتاخرين ان الاجماع مستند معظم الشريعة فقد اخبر عن حاله فانه تنقص معرفته بالكتاب والسنة احتاج الى ذلك — وهذا كقولهم ان اكثر الحوادث يحتاج فيها الى القياس لعدم دلالة النصوص عليها فانما هذا قول من لا معرفة له بالكتاب والسنة ودلالتهما على الاحكام وقد قال الامام احمد رضى الله عنه انه ما من مسئلة الا وقد تكلم فيها الصحابة او فى نظيرها فانه لما فتحت البلاد وانتشر الاسلام حدثت جميع اجناس الاعمال

فتکلموا فیھا بالکتاب والسنۃ ۔ (ص ۲۱۳)

" اکثر متاخرین جو اسے اچھی طرح نہیں سمجھتے وہ اجماع اور قیاس سے دلیل شرعی طلب کرتے ہیں اور ان میں سے جو اس بات کا قائل ہے کہ اجماع شریعت میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اس کی کتاب و سنت کی سمجھ ناقص ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں قیاس کی ضرورت پیش آتی ہے ان پر نصوص شرعیہ دلالت نہیں کرتیں۔ یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے جسے کتاب و سنت کا اور جس بات پر وہ دلالت کرتی ہے کچھ پتہ نہ ہو۔ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس پر صحابہ کرامؓ نے بالصراحت یا اس کی نظیر سے متعلق کلام نہ کر دیا ہو کیونکہ جب مختلف شہر فتح ہوئے اور اسلام پھیلا تو ہر قسم کے مسائل پیدا ہوئے جن پر صحابہؓ نے کتاب و سنت کے دلائل کی مدد سے روشنی ڈالی۔"

امام غزالیؒ نے لکھا ہے:

الصحیح ان الاستدلال المرسل فی الشرع لا یتصور حتی یتکلم فیہ بنفی او اثبات اذ الوقائع لاحصر لھا وکذا المصالح وما مسألۃ تعرض الا وفی الشرع دلیل علیہ اما بالقبول او بالرد (الی ان قال) فنخرج منہ ان کل مصلحۃ یتخیل فی کل واقعۃ محتوشۃ بالاصول المتعارضۃ ولا بد وان تشھد الاصول لردھا او لقبولھا فاما تقدیر جریانھا مھملا غفلا لا یلاحظ اصلا فمحال تخیلا۔

(المنخول ص ۳۳۲)

"صحیح بات یہ ہے کہ شریعت میں ایسے استدلال کا تصور ممکن نہیں جس کا رشتہ اصل ماخذ سے نہ ملتا ہو۔ خواہ واقعات و مصلحتیں لاانتہا ہیں مگر ان کے بارے میں نفی یا اثبات میں گفتگو نہیں کی جا سکتی کیونکہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق شریعت میں اس کے حق میں یا اس کے خلاف دلائل موجود نہ ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ ہر واقعہ میں جو کوئی مصلحت بھی متصور ہو سکتی ہے اس کے خلاف یا اس کے حق میں شہادت موجود ہے۔ پس ایسی صورت جو کسی اصل سے نہ جا ملتی ہو اس کا تخیل محال ہے۔"

(باقی)

دعوت اور کامیابی

سید اسعد گیلانی

اس میں کیا شک ہے کہ دعوتِ اِلیٰ اللہ اپنے وجود سے ہی کامیابی کا مطالبہ کرتی ہے اور کامیابی سے مراد دعوت کا غلبہ اور تسلط ہے تاکہ نظامِ حق نافذ ہو اور نظامِ باطل سے سسکتی اور کراہتی ہوئی انسانیت کو نجات ملے۔ مخلوق پر ان کے خالق کا اور بندوں پر ان کے مالک کا حکم نافذ ہونا ایک ایسا حق ہے جسے کسی دلیل سے بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن باطل تو دھاندلی اور زبردستی سے حق کے خلاف سرکشی اور بغاوت کرنے کا نام ہی ہے اسے بھلا دلیل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اللہ کی بندگی کی طرف دعوت انسانی معاشرے کا ایک مستقل رُخ ہے۔ یہ دعوت ہمیشہ پیش کی جاتی رہی ہے اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ سے سرکشی تو موجود ہو لیکن اس کی بندگی کی طرف دعوت موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑا ہے۔ البتہ جو لوگ روشنی کو دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیں انہیں سامنے چمکتا ہوا سورج بھی دکھائی نہیں دے سکتا۔

دعوت اِلیٰ اللہ کے آغاز کے ساتھ ہی معاشرے کے فعّال سرکش عناصر کی طرف سے مزاحمت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور یوں خالق و مخلوق کے درمیان پردے حائل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بلکہ مخلوق کو جبراً اپنے خالق سے بے خبر رکھ کر منحرف کرنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ لیکن پیغامِ حق ایک شجرِ طیب کی کونپل کے مانند ہوتا ہے جو سخت زمین کا سینہ چیر کر نمودار ہو جاتا ہے اور اس کے وجود کے اظہار میں کوئی شے بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ دعوت ایک ایسے یقینِ محکم کی مدد سے ایک ایسے یقینِ محکم کی طرف دی جاتی ہے جو کسی جبر و تشدد یا رشتہ و ناطہ کے دباؤ سے دب نہیں سکتا اور دعوت دینے والا شخص اپنی دعوت کی قوت سے اپنی ذات کی حد تک لوہے سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط عزم کا

حامل ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے ساتھ مل کر کام کرنے والی ٹیم کا تعلق ہے اس کا مسئلہ داعی سے ذرا کچھ مختلف ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے پاس دعوت دوسرے درجے میں پہنچتی ہے اور اس کا یقین محکم اپنے ایثار و قربانی کے ناطے اور تناسب سے ہی ثابت ہوتا ہے۔

اسی لیے دعوت کا داعی حکمت و تدبر کے نقطۂ نظر سے اپنے ساتھیوں کے آزمائش میں پڑنے سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ جانتا ہے کہ آزمائش کی بھٹی ان اینٹوں کو ایسا پکا دے گی کہ اس سے نئے نظام کا قصرِ عالیشان تعمیر ہو سکے گا، اور اگر آزمائش نہ آئے گی تو نئے نظام کی عمارت کے لیے پختہ اینٹیں تیار نہ ہوں گی۔ اس لیے آزمائش دعوت کی اپنی ایک داخلی ناگزیر ضرورت ہے۔ اس سے وہ قیادت تیار ہوتی ہے جسے نئے نظام کو چلانا ہوتا ہے۔ اگر یہ قیادت کسی صورت تیار نہ ہو تو اول تو وہ نظام آتا ہی نہیں اور اگر آجائے تو زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آزادی، قربانی اور جدوجہد کے بغیر نہیں ملتی اور اگر کسی صورت مل جائے تو قربانی کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔

چنانچہ دعوت کی کامیابی کا تصور داعی کی دعوت سے کہیں زیادہ اس امر کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے کہ دعوت پر لبیک کہنے والے لوگ کس تعداد میں آئے ہیں، جو آئے ہیں وہ کس درجے اور پائے کے لوگ ہیں، ان پر آزمائشیں کس نوعیت کی اور کس قدر آئی ہیں اور ان آزمائشوں میں انھوں نے کیا کردار ادا کیا ہے۔ ان افراد کی تعداد، نوعیت، طرزِ عمل اور کردار وہ چیزیں ہیں جو دعوت کے غلبہ یا ناکامی میں بہت بڑا حصہ ادا کرتی ہیں۔ دعوت اِلی اللہ کی فطرت میں تو اپنی ماہیت کے لحاظ سے بلاشبہہ کامیابی ہی پوشیدہ ہے لیکن اس پوشیدہ کامیابی کے ظاہر کرنے اور اسے زمین پر نافذ کرنے میں اس کے ماننے والوں کا بہت غالب حصہ ہوتا ہے۔

یہ لازم نہیں ہے کہ دعوت کو قبول کرنے والا ہر قافلہ منزل تک ضرور پہنچ ہی جائے۔ جب شرائط پوری نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اس سے بے نیاز ہے کہ نفاذِ نظامِ اسلامی کی منزل تک کون پہنچتا ہے اور کون نہیں پہنچتا۔ اس کے ہاں اپنے بندوں کو نوازنے کا کوئی ایک ہی راستہ تو نہیں ہے۔ قرآن میں جن انبیا کا ذکر آتا ہے ان میں سے بیشتر اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل تک پہنچے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور قرآن نے ان سب کی مثالیں خدا کے کامیاب بندوں کی حیثیت سے ہی پیش کی ہیں۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوتِ حق پیش کی اور انھیں اللہ کی بندگی کی طرف بلایا۔

انسانی تاریخ کی طویل ترین مدّتِ دعوت اس قوم کو راہ راست پہ لانے کی کوشش میں صرف کی گئی۔ لیکن نہ تو اس قوم نے راہِ راست اختیار کی اور نہ اس قوم کے سرداروں اور سربراہوں نے وقت کے نبی کی کوئی بات چلنے دی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ (القمر۔۹)

"ان سے پہلے نوحؑ کی قوم جھٹلا چکی ہے۔ اس نے ہمارے بندے کو جھوٹا کہا، دیوانہ کہا اور جھڑک دیا۔"

حضرت نوحؑ کے بعد ایک اور معاشرہ قوم عاد کا بھی تھا۔ جس کے سامنے حضرت ہودؑ نے دعوتِ حق پیش کی۔ جس جس احسن طریقے سے ممکن تھی دعوت پیش کی گئی۔ لیکن ان ظالموں نے تو ہر ظالم وجابر دشمنِ حق کی پیروی کرنا پسند کیا اور اللہ کے راستے اور نبی کے بتائے ہوئے طریقے کی طرف آنے سے صاف انکار کر دیا۔

قَالُوا يٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (ھود۔۵۳)

"وہ بولے اے ہودؑ، ہم تمہیں کسی سند کا حامل نہیں دیکھتے اور نہ ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ ہم تمہاری باتیں تسلیم کرتے ہیں۔"

پھر ایک اور معاشرہ حضرت صالحؑ کے زیرِ تبلیغ بھی تھا۔ یہ لوگ ثمود کہلاتے تھے۔ ان کے سامنے بھی حضرت صالحؑ نے پاکیزہ رنگ میں دعوتِ حق پیش کی۔ لیکن ان کا جواب بھی سراسر ضد، عناد اور عصبیتِ جاہلیہ پر مبنی تھا اور وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے پہ تیار نہ تھے۔

قَالُوا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (ھود۔۶۲)

"انہوں نے کہا اے صالحؑ تجھ سے تو ہمیں پہلے بڑی امیدیں تھیں۔ کیا تو ہمیں ان کی پرستش سے منع کرتا ہے جن کی پرستش ہمارے آباو اجداد کرتے رہے ہیں اور ہم کو تو سخت الجھن میں ڈالنے والا شبہ ہے اس چیز کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔"

پھر ایک قوم وہ بھی تھی جس کو حضرت ابراہیمؑ نے دینِ حق کی طرف دعوت دی تھی۔ لیکن ان کا حال

یہ تھا کہ دعوتِ حق کے جواب میں جہاں قوم نے ان کے لیے آگ کا الاؤ تیار کرایا وہاں ان کے باپ نے انہیں جھڑک کر گھر سے ہی نکال دیا اور ان کی حمایت سے یکسر ہاتھ اٹھا لیا۔ بلکہ حق کی مخالفت میں دوسروں سے بھی آگے نکل گیا اور کہا:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (مریم۔۴۶)

"اے ابراہیمؑ، اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ تو میرے پاس سے دور ہو جا۔"

اسی طرح ایک قوم سے حضرت لوطؑ کو بھی واسطہ پڑا تھا جو گمراہی میں کچھ زیادہ ہی بھٹکی ہوئی تھی۔ حضرت لوطؑ نے ان کے سامنے زندگی کی صراطِ مستقیم یعنی دینِ حق پیش کرنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔ اور انہوں نے حضرت لوطؑ کی ایک نہ سنی، بلکہ ان کی نصیحتوں کا یہ جواب دیا۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (الشعراء۔۱۶۷)

"اے لوطؑ اگر تو نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو ہم تجھے اپنے ہاں سے نکال دیں گے۔"

پھر حضرت شعیبؑ نے بھی اپنے دور کے ایک معاشرے اہل مدین اور اصحاب الأیکہ کے سامنے دعوتِ حق پیش کی تھی اور انہیں بدیوں سے نکال کر نیکیوں کی طرف، کاروبار میں دھوکہ دہی سے نکال کر راست بازی کی طرف، اور ناخدا ترسی سے خدا ترسی کی طرف لانا چاہا تھا۔ لیکن ان کی دعوت کا جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ:

قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ٭ وَمَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ (الشعراء۔۱۸۶)

"کہنے لگے (اے شعیبؑ) تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے اور تو بھی ہمارے جیسا ایک آدمی ہی ہے، ہمارے خیال میں تو تو جھوٹا ہے۔"

یوں تاریخ کے مختلف ادوار میں قوموں کے مختلف معاشروں میں دعوتِ حق پیش ہوتی رہی اور قوموں کے معاشرے کی طرف سے اکثر گمراہی پر ہی اصرار کیا جاتا رہا۔ اکثر و بیشتر تو ان قوموں کے سربراہوں نے ہی رکاوٹیں ڈالیں۔ الزام اور بہتان تراشی ان کا خصوصی ہتھیار رہا ہے۔ شیطان ہمیشہ ضد، عصبیت، ناخدا ترسی، مفاد پرستی، خود غرضی، غرور اور کبر و نخوت کے ہتھیاروں سے انہیں شکار کرتا اور راہِ راست پر آنے سے روکتا رہا۔ ان لوگوں کی اکثریت ہمیشہ خدا سے بے نیاز اور دینِ حق سے بے رغبت

ہی رہی - اور بعض حالات میں قائل ہونے کے باوجود اپنے چوہدریوں اور رہنماؤں کی قیادت میں دعوتِ حق سے دور رہی اور ایک جاندار اور بہادر معمولی سی اقلیت ہی آگے بڑھ کر حق کا ساتھ دیتی رہی -

اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں جو تحریک اُٹھائی گئی تھی اگرچہ نسلی طور پر اس تحریک کے نام لیوا لاکھوں کی تعداد میں تھے اور وہ ایک بہت مالدار قوم بھی تھی لیکن حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کی تھُڑ دِلی اسلامی انقلاب کے اقدامات کو آگے بڑھانے میں مسلسل رکاوٹ بنتی رہی - جب ان سے کہا گیا کہ تم اس مقدس سرزمینِ فلسطین میں داخل ہو جاؤ جو تمہارے لیے لکھ دی گئی ہے تو انہوں نے جواب دیا -

إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ - (المائدہ - ۲۴)

"اے موسیٰؑ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں - بس تم اور تمہارا رب دونوں وہاں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں"۔

لیکن اس کے مقابلے میں وہ اسلامی تحریک جو اس دنیا میں عظیم ترین مثالی اسلامی تحریک تھی اس کے قائد و ہادیؐ و رہنما نے غزوۂ بدر کے موقع پر جب اپنے ساتھیوں سے انتہائی بے سروسامانی اور کس مپرسی کی حالت میں سہل الحصول قافلے کے بجائے کفار کے بھاری لشکر سے لڑنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے کہا -

" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلیے ہم آپ کے ساتھ ہیں جس طرف بھی آپ جائیں - ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں - نہیں ہم یہ کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے - جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے"- یہ مہاجرین کے نمائندے کا جواب تھا لیکن جب حضورؐ نے اپنا سوال دہرایا تو پھر حضورؐ کے ساتھیوں کا دوسرا گروہ جو انصار پر مشتمل تھا ان کا نمائندہ (سعدؓ بن معاذ) اُٹھا اور اُس نے کہا -

"شاید آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے - حضورؐ ہم آپ پر ایمان لائے ہیں - آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپؐ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں - پس اے اللہ کے رسولؐ جو کچھ آپ نے ارادہ فرمایا ہے اسے کر گزریے - قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپؐ کو

حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں لے کر سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اُتر جائیں تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلے میں جاں نثاری دکھائیں گے۔ اور بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیے۔"

(دیباچہ سورہ انفال تفہیم القرآن جلد دوم)

ظاہر ہے کہ جاں نثاری اور قربانی و ایثار کے ان والہانہ جذبات کے ساتھ جس تحریک کے ساتھی اپنے مقصد کا ساتھ دیں اس تحریک کے قدموں کو کامیابی و کامرانی کی منزل پہ پہنچنے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے سے دنیا کی کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے فتح و نصرت کے بند دروازے کھول دیتا ہے اور ان پر نصرتِ الٰہی نازل ہوتی ہے اور ان کے ہاتھوں انسانیت فلاح کا راستہ ضرور ہی پا لیتی ہے۔

رسائل و مسائل

اعتراضات

ماہ اپریل کے ترجمان القرآن میں آپ کا جو مقالہ بعنوان "اسلام کس چیز کا علمبردار ہے؟" چھپا ہے۔ اس کے مندرجات میں سے کچھ پر یہ اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "پیغمبرؐ مافوق البشر نہیں ہوتا"۔ اس کا کیا مفہوم ہے؟ کیا اس سے مراد خدائی اختیارات کا حامل ہونا ہے؟ یا بشریت سے ماوراء ہونا؟ معترضین نے یہ نکتہ برآمد کیا ہے کہ مافوق البشر کا مطلب عام بشر سے فائق ہونا ہے اور پیغمبر اس معاملے میں فائق ہی ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ مقالہ نویس نے پیغمبرؐ کو بشری کمزوریوں سے مبرا تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے معصوم ہوتے ہیں۔ بشری کمزوریوں سے مراد بشریت کے لوازمات ہیں یا اور کچھ مراد ہے؟

۳۔ بعض پیغمبروں کا مشن ناکام ہو گیا۔ یہ اندازِ بیان انبیاء کے شایانِ شان نہیں ہے۔ معترضین کا زیادہ تر زور اس پر تھا کہ چاہے نیت بخیر ہو مگر اندازِ بیان گستاخانہ ہے۔

جواب: ان اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ مقالہ دراصل غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس میں اُن کے غلط عقائد کا ذکر کیے بغیر اُن کی تردید اس طرح کی گئی ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر اُن کے سامنے رکھ دی گئی جسے دیکھ کر وہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کے مذاہب میں کیا کیا غلط باتیں شامل ہو گئی ہیں۔

اب ایک ایک اعتراض کو لیجیے:

۱۔ "پیغمبر فوق البشر نہیں ہوتا"۔ اس فقرے سے کوئی معنی اخذ کرنے سے پہلے معترض کو دیکھنا چاہیے کہ میں نے کس سلسلۂ کلام میں یہ بات کہی ہے۔ اوپر سے عبارت یوں چلی آ رہی ہے کہ "رسول ایک انسان

ہے اور خدائی میں اس کا ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کے معاً بعد یہ کہنا کہ "وہ فوق البشر نہیں ہے" صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ بشریت سے ماوراء اور خدائی صفات سے متصف نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مذاہب والوں نے اپنے پیشواؤں کو بنا رکھا ہے۔

۲- اسی سلسلہ کلام میں فوراً بعد دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ "رسول بشری کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہے"۔ اس میں بشری کمزوریوں سے مراد بھوک، پیاس، نیند، مرض، رنج و غم وغیرہ امور ہیں جو بشر ہی کو لاحق ہوتے ہیں۔ اور اس مضمون میں یہ بات اس غرض کے لیے کہی گئی ہے کہ عیسائیوں نے جس ہستی کو خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے ڈالا اس کو بھی یہ بشری کمزوریاں لاحق ہوتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ بشر کو خدائی میں شریک قرار دے بیٹھے۔ یہ استدلال ٹھیک ٹھیک قرآن سے ماخوذ ہے۔ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ، وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ، كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ (۵:۷۵) "مریم کا بیٹا مسیح رسول کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی رسول گذر چکے تھے، اور اس کی ماں راست باز تھی، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے"۔ اس آیت میں ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے اور ماں بیٹے، دونوں کے کھانا کھانے کو اس بات کی صریح دلیل ٹھیرایا گیا ہے کہ حضرت مسیح بشر تھے نہ کہ فوق البشر اور اُلوہیت میں اُن کا قطعاً کوئی حصہ نہ تھا، جیسا کہ مسیحیوں نے سمجھ رکھا ہے۔

۳- تیسرا اعتراض بھی سلسلۂ کلام کو نظرانداز کر کے صرف ایک لفظ کے استعمال پر کیا گیا ہے۔ سلسلۂ کلام یہ ہے کہ نبی کا کام ایمان لانے والوں کو انفرادی اور اجتماعی تربیت دے کر ایک صحیح اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے عملاً تیار کرنا اور ان کو منظم کر کے ایک ایسی جماعت بنا دینا ہے جو دنیا میں خدا کے دین کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد کرے یہاں تک کہ خدا کا کلمہ بلند ہو جائے اور دوسرے کلمے پست ہو کر رہ جائیں۔ اس کے بعد یہ عبارت لکھی گئی ہے: "ضروری نہیں ہے کہ سب نبی اپنے اس مشن کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچانے میں کامیاب ہی ہو گئے ہوں۔ بہت سے انبیاء ایسے ہیں جو اپنے کسی قصور کی بنا پر نہیں بلکہ متعصب لوگوں کی مزاحمت اور حالات کی نامساعدت کے باعث اس میں ناکام ہو گئے"۔

اس عبارت میں لفظ ناکام کے استعمال کو گستاخی کہنا آخر ادب و احترام کی کونسی قسم ہے؟ یہ مبالغہ آمیزیاں اگر اسی شان سے بڑھتی رہیں تو بعید نہیں کہ کل ہر وہ شخص گستاخ ہو جو کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد میں زخمی ہو گئے تھے، یا آپ کسی وقت بیمار ہو گئے تھے۔ کسی واقعہ کے واقع ہونے

سے اگر انکار نہیں ہے تو اس کو انہی الفاظ میں بیان کیا جائے گا جو زبان میں معروف ہیں۔ جو حضرات اسے گستاخی سمجھتے ہیں وہ اپنی رائے کے مختار ہیں، مگر دوسروں پر وہ اس رائے کو کیوں مسلط کرتے ہیں؟

اسرائیلی ریاست کے حق میں ایک عجیب استدلال

سوال:۔ "سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۰۴ کے متعلق "صدق جدید" (لکھنو) میں مولانا عبدالماجد دریاباوی نے "سچی باتوں" کے زیر عنوان یہ تشریح کی ہے کہ اس میں وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد یوم الآخرۃ نہیں ہے بلکہ قیامت کے قریب ایک وقت موعود ہے اور جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا سے مراد بنی اسرائیل کے مختلف گروہوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دینا ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ" اب مطلب واضح ہے۔ یعنی اسرائیلیوں کو بعدِ واقعہ فرعون ہی خبر دے دی گئی تھی کہ اب تو تم آزاد ہو، دنیا میں جہاں چاہو رہو بسو، البتہ جب زمانہ قربِ قیامت کا آ لگے گا تو ہم تم کو مختلف سمتوں سے، مختلف ملکوں سے، مختلف زبانیں بولتے ہوئے، مختلف وضع و لباس اختیار کیے ہوئے، سب کو ایک جگہ جمع کر دیں گے۔ اور وہ جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے بجز اُن کے قدیم وطن ملک فلسطین کے۔ آج جو ارضِ فلسطین میں یہود کا اجتماع ہر ہر ملک سے ہو رہا ہے کیا یہ اسی غیبی پیش خبری کا ظہور نہیں؟" یہ نتیجہ جو مولانا نے اس آیت سے نکالا ہے، مجھے ڈر ہے کہ یہ فلسطین کے متعلق عام جذبہ جہاد کو ٹھنڈا کر دے گا۔ کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد تو فلسطین میں اسرائیلی ریاست کا قیام عین منشائے خداوندی سمجھا جاتے گا۔"

جواب:۔ آیت مذکورۂ بالا کی اس تشریح کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آیت کے الفاظ تو صرف یہ ہیں کہ:۔

وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا۔

"اور اس کے بعد (یعنی فرعون کی غرقابی کے بعد) ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین میں رہو بسو، پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم کو اکٹھا کر لائیں گے۔"

ان الفاظ میں "قربِ قیامت کے وقتِ موعود" اور "بنی اسرائیل کے وطنِ قدیم میں یہودیوں کے مختلف گروہوں کو ملک ملک سے لا کر جمع کر دینے" کا مفہوم آخر کہاں سے نکل آیا۔ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کا سیدھا

اور صاف مطلب آخرت کا وعدہ ہے نہ کہ قیامت کے قریب زمانے کا کوئی وقتِ موعود۔ اور سب کو اکٹھا کر لانے یا جمع کر لانے سے مراد قیامت کے روز جمع کرنا ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک اس بات کی طرف نہیں ہے کہ اسی دنیا میں بنی اسرائیل کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔ اس پر مزید ستم یہ ہے کہ "ایک جگہ جمع کرنے" کے تصور کو آیت کے الفاظ میں داخل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی طے کر دیا گیا کہ وہ جگہ "اسرائیلیوں کے وطنِ قدیم" کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ توجیہ بعینہٖ یہودیوں کے اس دعوے کی تائید ہے کہ دو ہزار برس تک فلسطین سے بے دخل رہنے کے باوجود اس پر ان کا حق فائق ہے کیونکہ وہ ان کا وطنِ قدیم ہے، اور اب دو ہزار برس سے یہ ملک جن لوگوں کا حقیقت میں وطن ہے اُن کے مقابلے میں برطانیہ اور رُوس اور امریکہ نے نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر یہودیوں کے حقِ سکونت کو فائق قرار دے کر انہیں ہر ملک سے وہاں جمع کروایا ہے۔ اس طرح تو اسرائیلی ریاست کا قیام اللہ تعالیٰ کے ایک وعدے کا نتیجہ قرار پاتا ہے نہ کہ دنیا کی ظالم قوموں کی ایک سازش کا۔ حالانکہ آیت کے الفاظ میں اس مفہوم کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام کے نام لیواؤں کی غیر اسلامی حرکات

سوال:۔ آج کل ایک مذہبی تنظیم کے بعض حضرات تین کتابیں بڑی سرگرمی سے پھیلا اور لوگوں کو پڑھا رہے ہیں۔ تینوں ارشد القادری صاحب نے لکھی ہیں جو بہار (بھارت) کے باشندے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں، جماعتِ اسلامی، تبلیغی جماعت، زلزلے۔ پہلی دو کتابیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے خلاف اور تیسری دیوبندی علماء کی تردید میں ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں مولانا مودودی کی بہت سی تحریریں نقل کی گئی ہیں جو کتابوں کے علاوہ ترجمان القرآن کے پرانے پرچوں سے جمع کی گئی ہیں۔ یہ پرچے اب آسانی سے دستیاب نہیں بلکہ بعض تو بالکل نایاب ہیں، اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"۔ اس پوری کتاب کا جواب لکھنا تو دشوار بلکہ بیکار ہے۔ لیکن چند سوالوں کو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر اگر آپ انتخاب کرلیں اور ان کی حقیقت واضح کردیں تو عوام الناس کو کچھ تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ نظامِ مصطفیٰ کے قیام کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ کن حربوں سے کام لے رہے ہیں۔ آپ لوگوں کی مکمل خاموشی کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ اعتراضات سب صحیح اور بجا ہیں اور ان کا کوئی جواب ممکن نہیں۔ ارشد القادری

صاحب کے نام کے ساتھ کتاب پر سکرٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں دنیا بھر کے مسلمانوں میں پھیلائی جاتی ہوں گی اور انہیں بدگمانی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جاتی ہوگی۔

جواب:- (از ملک غلام علی صاحب) جناب قادری صاحب کا کتابچہ "جماعت اسلامی" میری نظر سے گزرا ہے۔ میں اس کے چند اقتباسات نمونۃً پیش کرتا ہوں جس سے ہر شخص بآسانی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ صاحب خوفِ خدا اور محاسبۂ آخرت سے کتنے عاری اور جھوٹ گھڑنے میں کتنے ماہر اور جری ہیں۔ اپنی کتاب کے صـ۲۱ پر انہوں نے مولانا مودودی صاحب کی تصنیف تنقیحات سے ایک عبارت یوں نقل کی ہے:-

"قرآن و سنتِ رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر قرآن و حدیث کے پرانے ذخیرے سے نہیں"۔
تنقیحات صـ۱۱۴

اس عبارت پر یہ حضرت یوں تبصرہ کرتے ہیں،

"جب تک کوئی نیا رسول نہ پیدا ہو قرآن و حدیث کا نیا ذخیرہ کہاں سے فراہم ہوسکتا ہے۔ دیکھنا چاہیے آگے کیا گل کھلتا ہے"؟

تنقیحات کے جس مضمون کا ایک فقرہ ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے اُس مضمون کا عنوان دینے سے گریز کیا گیا ہے تاکہ اصل ماخذ آسانی سے نہ مل سکے۔ تاہم میں نے تلاش کے بعد وہ ایڈیشن فراہم کر لیا جس کے صـ۱۱۴ ہی پر یہ عبارت موجود ہے۔ پوری عبارت درج ذیل ہے،

"قرآن اور سنتِ رسولؐ کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ ان کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہییں جو قرآن اور سنت کے مغز کو پا چکے ہوں"۔
(تنقیحات صـ۱۱۴، پانچواں ایڈیشن، مکتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام پٹھانکوٹ)

قادری صاحب کا کرتب ملاحظہ ہو کہ تفسیر کے لفظ کو قرآن کے لفظ سے بدل کر قاری کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی کسی نئے قرآن کی تعلیم کا مشورہ دے رہے ہیں، حالانکہ مولانا صاحب کا مدعا صرف یہ ہے کہ تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں یا ان کے ترجموں کو مِنّ و عَن نئے تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے بغیر کسی راسخ العلم اور وسیع النظر استاذ کے رکھ دینا مناسب نہیں ہے۔ تفاسیر میں ہر طرح کا رطب و یابس اور کچا پکا مواد موجود ہے۔ حدیث کے ذخیروں میں صحیح، ضعیف، موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں اور کتب صحاح میں بھی

بے شمار احادیث ایسی ہیں جن کے مابین توفیق و تطبیق یا ایک کو دوسری پر ترجیح دینا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ مگر اصل الفاظ میں تحریف اور قطع و برید کے بعد ان سے مفہوم برآمد کیا جا رہا ہے کہ قرآن و حدیث ہر شے اب پرانی ہو چکی ہے، اب کوئی نیا قرآن اور نئی احادیث درکار ہیں جن کی تعلیم دلائی جائے گی۔

اس کتابچے کے صفحہ ۲۶ کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

"مولانا مودودی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"فقہا کا قانون اپنی سختیوں کی وجہ سے عورتوں کی زندگیوں کو تباہ کرنے والا اور انہیں مرتد بنانے والا ہے"۔ (ترجمان القرآن مئی ۱۹۴۹ء)

اب حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ تحریر نہ مولانا مودودی کی ہے، نہ مئی ۱۹۴۹ء کا کوئی پرچہ سرے سے کبھی چھپ کر عالمِ وجود میں آیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ترجمان القرآن کی اشاعت ایک سال تک بند رہی اور جون ۱۹۴۸ء تا ستمبر ۱۹۴۸ء ترجمان القرآن کے صرف چار ماہانہ پرچے چھپ سکے تھے کہ مولانا مودودی پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ ترجمان القرآن پھر بند ہو گیا اور پورے آٹھ ماہ (اکتوبر ۱۹۴۸ء تا مئی ۱۹۴۹ء) تک بند رہا۔ جون ۱۹۴۹ء میں جا کر التواء کے بعد پہلا پرچہ پریس اور پرنٹر پبلشر کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہو سکا۔ اس جون ۱۹۴۹ء کے پرچے میں اس بندش کی پوری روداد اور اعلان نمایاں طور پر مطبوعہ موجود ہے جس کا جی چاہے دیکھ سکتا ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور میں دوبارہ پوری صفائی سے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ عبارت جو مئی ۱۹۴۹ء کے ترجمان کے حوالے سے مولانا مودودی کی جانب منسوب کی گئی ہے، یہ ہرگز کبھی ان کے قلم سے نہیں نکلی۔ یہ ان کی زبان اور اندازِ بیان ہی نہیں ہے۔ میں اسد القادری صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مولانا کی کسی کتاب یا رسالے سے یہ عبارت نکال کر دکھائیں ورنہ دنیا و آخرت میں لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے سزاوار بننے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اپنے کتابچے کے ص ۲۹ پر یہ صاحب ترجمان القرآن کی ایک عبارت مولانا مودودی کی طرف یوں منسوب کرتے ہیں:

"حضرت خالدؓ بن ولید کی دینی حمیت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے مولانا مودودی تحریر کرتے ہیں۔

"اسلام کی عاقلانہ ذہنیت کسی خفیف سے خفیف غیر اسلامی جذبہ کی شرکت بھی گوارا نہیں کر سکتی

اور اس معاملہ میں اس قدر نفس کے میلانات سے متنفر ہے کہ حضرت خالد جیسے صاحبِ فہم انسان کو اس کی تمیز مشکل ہو گئی۔" (ترجمان القرآن ربیع الثانی ۵۰ھ)

یہاں پھر محض مہینے اور سن کا حوالہ دے دیا گیا مگر صفحے کا نمبر یا مضمون کا عنوان نہیں دیا گیا جس مضمون سے یہ فقرہ کاٹ کر نقل کیا گیا ہے، اس مضمون کا عنوان "معرکہ اسلام و جاہلیت" ہے اور وہ صدر الدین اصلاحی کا تحریر کردہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس اقتباس کو اگر سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں، سوال یہ ہے کہ یہ کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے کہ دوسروں کی عبارات کو دیدہ و دانستہ مولانا مودودی کے سر منڈھ دیا جائے۔ کسی رسالے یا اخبار میں جو چیز چھپتی ہے اس کا مالک یا مدیر محض اس وجہ سے تو اس کا مصنف نہیں بن جاتا کہ یہ اس کے رسالے میں چھپ گئی ہے۔ ہر شخص کا ایک اپنا طرزِ بیان اور اسلوبِ فکر ہوتا ہے جس کا وہ خود ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ پھر اس اقتباس و انتساب میں دہری خیانت یہ ہے کہ مولانا صدر الدین کی بھی پوری بات نقل نہیں کی گئی جس میں انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ حضرت خالدؓ نے دورانِ جنگ میں ایک دشمن پر وار کیا اور اس کے کلمہ طیبہ پڑھ دینے کے باوجود اسے قتل کر دیا۔ جس پر آنحضورؐ نے سخت باز پرس فرمائی کہ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ میں اس فعل سے بری ہوں۔ اس کے بعد اس عبارت پر وہی شخص اعتراض کرے گا جو درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو ہدفِ اعتراض بنانا چاہے گا کہ آپ نے حضرت خالدؓ کے فعل پر ایسی سرزنش اور برأت کیسے اور کس لیے فرمائی؟

پھر قادری صاحب نے اسی ایک غلط انتساب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مولانا صدر الدین صاحب کے اسی مضمون سے مزید تین اقتباسات اپنی کتاب کے صہ ۳۰، صہ ۳۲، صہ ۳۳ پر بلا تامل مولانا مودودی سے منسوب کر دیے ہیں اور تینوں کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

مولانا مودودی ایک جگہ لکھتے ہیں...... مولانا مودودی ان الفاظ میں خلیفۂ اوّل پر نکتہ چینی کرتے ہیں... ان الفاظ میں خلیفۂ دوم پر مولانا مودودی نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ان تینوں صفحات پر چوکھٹے بنا کر جو عبارات نقل کی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک لفظ بھی مولانا مودودی کا تحریر کردہ نہیں۔ مجھے اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں پورے اقتباسات اور ان پر اسد القادری صاحب کی حاشیہ آرائی نقل کرتا۔ یہ عبارتیں اگرچہ بجائے خود بے غبار ہیں اور ان میں کوئی پہلو اعتراض (باقی بر صفحہ ۴۸)

مطبوعات

۱۔ بچوں کے لیے قرآن	مرتب :۔ ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب
۲۔ بچوں کے لیے حدیث	مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب پاکستان کے تعلیمی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں آپ کی آراء بڑی وقیع خیال کی جاتی ہیں۔ آپ نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کی غرض سے ان کے نفسیاتی معیار کے مطابق چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

"بچوں کے لیے قرآن" میں آپ نے چند تمہیدی صفحات میں قرآن مجید کی تکمیل، اس کی تعظیم، اس کے مقصد اور قرآنی عربی سمجھنے کے لیے آسان طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی منتخب آیات کو چھ مختلف ابواب میں ترتیب دیا ہے۔ اس کے لیے آپ نے ایسی آیات جمع کی ہیں جو بچوں کے ذہنی معیار کے مطابق بھی ہیں اور ان کی اصلاح و ضرورت کے لیے مفید بھی۔ پہلے باب میں خدا اور بندے کے تعلق کو ظاہر کرنے والی آیات ہیں۔ دوسرے باب میں ایک مسلمان کا اپنے دین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ذکر ہے۔ نیز نماز کی اہمیت اور انسانی زندگی کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ایسی آیات درج ہیں جن میں معروف کا ذکر ہے۔ اسی طرح چوتھے باب میں منکرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں اصلاح و ترقی کے لیے عمل کی ترغیب اور چھٹے میں آسان قرآنی دعاؤں کا اندراج ہے۔

اسی طرح "بچوں کے لیے حدیث" میں پہلے چند صفحات میں حدیث پاک کی قسموں اور ان کے مختلف مجموعوں کا ذکر ہے جس کے ساتھ صحاح ستہ کا ابتدائی تعارف بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو بارہ ۱۲ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ایمانیات اور معاشرت کی ساری اہم باتوں کا تذکرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں بچوں کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں بہت مفید ہیں۔

دونوں کتابوں کے ٹائیٹل بڑے جاذب نظر ہیں اور ان کی طباعت میں بڑے اہتمام سے کام لیا گیا ہے جن کے باعث یہ کتابیں بڑی صوری خوبیوں کی حامل ہو گئی ہیں۔

اتنی توجہ سے طبع ہونے والی ان دونوں کتابوں میں ہمیں عربی متن کی چند غلطیاں نظر آتی ہیں جن کا درست کرنا ضروری ہے۔ اگلے ایڈیشن میں انہیں درست کر دینا چاہیے۔

بچوں کے لیے قرآن میں:-

صفحہ ۵۲ پر لفظ السلٰم میں لٰ پر ایک الف زائد لکھا گیا ہے۔

صفحہ ۶۵ پر لفظ کانوا میں الف کتابت میں رہ گیا ہے۔

صفحہ ۹۲ پر لفظ محسنون میں ح پر ایک غلط نقطہ لگ گیا ہے۔

صفحہ ۱۴۵ پر لفظ سوءً میں ایک الف زائد درج ہو گیا ہے۔

اور صفحہ ۱۵۶ پر لفظ اخطانا میں الف پر جزم نہیں لکھا گیا۔

اسی طرح بچوں کے لیے حدیث میں بھی چند اغلاط موجود ہیں۔

صفحہ ۴۲ پر یُقَبِّلَهُ میں لَ مضموم چاہیے۔

صفحہ ۴۳ پر تصافحوا میں الف کتابت میں رہ گیا ہے۔

صفحہ ۵۵ پر یَبْتَدِعُ میں دِ پر حرکت درج نہیں ہو سکی۔

صفحہ ۶۱ پر سَرَای میں چھوٹا الف سَ پر نہیں الف پر چاہیے۔

بچوں کے لیے قرآن ۱۶۰ صفحات کی کتاب ہے۔ بچوں کے لیے حدیث ۱۵۲ صفحات کی۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے پانچ روپے ہے جو زیادہ ہے۔ ہمارے خیال میں تعمیر سیرت کے سلسلے میں یہ دونوں کتابیں بہت مفید رہیں گی لہٰذا ان کی اشاعت خوب ہونی چاہیے۔

کلامِ حکیم | مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔

ناشر:- ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور

یہ کتاب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی شعری تخلیقات کا منتخب مجموعہ ہے جسے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب نے ترتیب دیا اور جون ۷۳ء

میں ادارہ "ثقافت اسلامیہ" لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ہم بھی فاضل مرتب کی اس رائے سے متفق ہیں کہ خلیفہ صاحب کا کلام جتنا بھی اور جیسا بھی ہے مقدار و معیار کے لحاظ سے زیادہ کڑے فنی احتساب کا متحمل نہیں ہوسکتا، نیز یہ کہ الفاظ کی موجودہ نشست و ترتیب کے لحاظ سے بعض اشعار اوزان سے گرے ہوئے ہیں۔ خلیفہ صاحب میں اعلیٰ فن کاروں کے اوصاف موجود ہونے کے باوجود فطری شاعر کا سا "طبیعت جنون" موجود نہیں ان کی شعر گوئی فطرت کا تقاضا نہ تھی بلکہ من کی محض ترنگ تھی"۔ البتہ اس کتاب کی طباعت سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے کلام کا دو تہائی حصہ محفوظ ہوگیا ہے۔ ہماری رائے میں اگر خلیفہ صاحب مرحوم کے کلام کو محفوظ رکھنا ضروری تھا تو دو تہائی کے بجائے اسے پورے کا پورا محفوظ کر لیا جاتا۔

بچوں کے خطرے | مصنف ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب۔ ناشر: فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

صفحات: ۱۷۶ قیمت: ۶۰۲۵ روپے

فاضل مصنف کی یہ کتاب بھی تعمیر سیرت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں بچوں کو پیش آنے والے مختلف خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے جنہیں فاضل مصنف نے مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور جسمانی، اخلاقی، تعلیمی، ذہنی، جذباتی، معاشرتی، تفریحی، تمدنی، اقتصادی، روحانی اور سیاسی خطرات کا الگ الگ تذکرہ کیا ہے۔ ہر خطرے کو بڑے آسان لفظوں اور عام فہم سادہ طریقے سے واضح کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فاضل مصنف نہ صرف بچوں کی نفسیات سے واقف ہیں بلکہ ہر روز پیش آنے والے معاملات کا بھی گہری نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے بڑے قریب سے ان خطرات کا مطالعہ کیا ہے اور نہایت مختصر الفاظ میں اکثر خطرات سے بچنے کے لیے مؤثر تدابیر بھی بیان کر دی ہیں۔ تاہم اس چھوٹی سی کتاب میں اصلاح کا کوئی جامع قابلِ عمل پروگرام درج نہیں۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں کوئی جامع منصوبہ بھی پیش کیا جائے۔ کتاب کو دیکھتے ہوئے ہمیں ایک کمی سی محسوس ہوئی ہے۔ جہاں کسی برائی کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اگر اسلامی اصول اور احکام کا تھوڑا سا تذکرہ بھی کر دیا جاتا تو کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔

ایک دو مقامات پہ بات اچھی طرح واضح نہیں ہوتی۔ مثلاً صفحہ ۴۸ پہ مقیاس ذہانت کا چارٹ تو درج کر دیا گیا ہے لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ چارٹ میں درج شدہ ہندسوں سے مراد کیا ہے۔

اسی طرح صفحہ ۳۸ پر امتحانات کے ذریعے لیاقت ناپنے کے غلط طریقے کی نشاندہی تو کر دی ہے لیکن صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود اپنے موضوع پر یہ چھوٹی سی کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ خوبصورت ٹائیٹل اور طباعت کے لحاظ سے اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں۔

پہاڑی کے چراغ | مصنف: جناب آبادشاہ پوری

طباعت: آفسٹ

صفحات: ۲۲۴ قیمت: ۸ روپے ۵۰ پیسے

شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - لاہور۔

جناب آبادشاہ پوری صاحب ایک صاحبِ طرز ادیب اور بالغ نظر عالم کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے تاریخ اسلام کی چند نمایاں شخصیتوں کے کردار بڑے حسین پیرائے میں پیش کیے ہیں۔ یہ کردار اپنے دور میں اسلامی سیرت کے مثالی نمونے تھے۔ انہوں نے ظلم وستم اور جبر واستبداد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انصاف اور حق پرستی کے پرچم بلند کیے، ہر طرح کی آزمائشوں کو بے مثل صبر وعزیمت کے ساتھ برداشت کیا۔

ان درخشاں شخصیتوں میں کہیں حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت سعید بن جبیر جیسے عابد و زاہد، فقیہہ ومحدث نظر آتے ہیں جو مستبد خلفائے بنی اُمیّہ کے سامنے کلمۂ حق بلند کرتے رہے، اور کہیں قاضی شریح اور امام ابو یوسف جیسے منصف حاکمانِ وقت کے خلاف فیصلے صادر کرتے سنائی دیتے ہیں۔ کہیں ابراہیم نخعی، طاؤس بن کیسان اور ابو حازم جیسے اعلیٰ کردار ہیں جو زہد و ورع، علم وفضل اور حق گوئی وبیباکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

فاضل مصنّف نے موئے قلم سے ان عظیم کرداروں کے خاکے اس انداز سے پیش کیے ہیں کہ قاری کے ذہن پر علم وفضل کی عظمت وجلالت کے نقش اُبھرتے ہیں حق گوئی وبیباکی، صبر وعزیمت اور ایثار وقربانی کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور ظالم وجابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا حوصلہ پرورش پاتا ہے۔

اس تالیف کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ آبادصاحب نے سارا مواد تاریخ (باقی مطبوعات پر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) تشویشناک ہر آن بڑھتے ہوئے جرائم کا خوفناک رجحان ہے۔ سیاسی استبداد کے نہایت بھیانک مظالم سے پوری قوم لرز اٹھی ہے۔ آئے دن گلی کوچوں میں ایسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے جو چند سال پیشتر اس ملک کے رہنے والوں کے تصور میں بھی نہ آسکتے تھے۔ اغوا نواب ہماری قومی زندگی کا ایک مشغلہ بن کر رہ گیا ہے .... مزدور طبقہ شدید اضطراب کی زد میں ہے۔ ہڑتالیں اس ملک کی صنعتی زندگی کا لازمی عضو بن چکی ہیں۔ اس لیے اگر آج کوئی شخص دیکھتا ہے کہ اُس کے گھر سے کوڑا کرکٹ نہیں اٹھایا گیا یا اُس کی ڈاک اُسے نہیں ملی، یا گاڑیاں وقت پر نہیں چلیں تو اُسے قطعاً حیران نہ ہونا چاہیے۔ اٹلی کے رہنے والوں کے لیے نوکرشاہی کا تسلط اور اُس کی ریشہ دوانیاں شدید پریشانی کا موجب ہیں۔ اِس ملک کے انتظام کے لیے اِس وقت چھپن ہزار سرکاری ادارے لاکھوں افراد پر مشتمل عملے کے ساتھ مصروفِ کار ہیں مگر سُرخ فیتے کی بدولت کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا۔"

ان اندوہناک حالات میں جب سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم اور ملکی نظم ونسق کا پورا نظام درہم برہم ہو چکا ہو اور زندگی ایک خوفناک عذاب کی صورت میں عوام پر مسلط ہو رہی ہو، تو اُن کے اندر بالکل قدرتی طور پر یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ آگے بڑھ کر انہیں اس عذاب سے نجات دلائے خواہ اس کے بدلے انہیں آزادی جیسی متاعِ گرانمایہ ہی سے محروم ہونا پڑے۔ آزادی یقیناً بہت بڑی نعمت ہے لیکن جب یہ آزادی خوفناک انتشار اور خلفشار کو جنم دینے لگے تو پھر عوام بے بسی کے عالم میں اپنی آزادی اور خود مختاری کو تیاگ کر قید خانوں کے اندر پناہ لینا گوارا کر لیتے ہیں کیونکہ اس سے جان کا تحفظ تو ممکن ہوتا ہے۔ ہٹلر، مسولینی، سٹالن اور اسی قبیل کے دوسرے آمروں نے اسی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر خوفناک قسم کی آمریت قائم کی۔ بدقسمتی سے آج پاکستان ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح شدید فکری انتشار کا شکار ہے اور یہ انتشار اسے بربادی کے دہانے تک لے آیا ہے۔ ان تشویشناک حالات کو دیکھتے ہوئے یہ خطرہ ہر وقت موجود ہے کہ یہ ملک بھی خلفشار کے خاتمہ کے لیے کہیں اشتراکیت کی آہنی جکڑ بندیاں قبول

کرنے پر مجبور نہ کر دیا جائے۔ خدا ہمیں انتشار جیسے مہلک مرض کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود بھی اس مرض کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں۔

(بقیہ رسائل و مسائل صہ ۴۲) کا نہیں ہے لیکن ان عبارتوں کو مولانا مودودی کے ذمے لگا دینا کھلی ہوئی فریب کاری اور جعل سازی ہے جو غالباً اس بھروسے پر کی گئی ہے کہ پچاس سال پرانا پرچہ اب کس کے پاس ہوگا کہ وہ اس میں دیکھ سکے کہ یہ تحریر فی الواقع مولانا مودودی کی ہے بھی یا نہیں۔ جو لوگ ایسی کارروائیاں کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اس ارشاد ربانی کو فراموش نہ کریں۔

لا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا ۔ اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی ۔

(تمہیں کسی گروہ کی عداوت اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کو ترک کر دو۔ عدل سے کام لو، یہی چیز پرہیز گاری سے قریب تر ہے)۔

(بقیہ مطبوعات)

کے مستند ترین مآخذ اور مصادر سے لیا ہے اور کمزور روایات سے حتی الوسع دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔

یہ ایمان افروز تالیف ایک ادبی پارہ بھی ہے جس میں مصنّف کا قلبی سوز و گداز بھی شامل ہے جس سے کتاب کی افادیت کافی حد تک بڑھ گئی ہے۔ مسلمانوں کے لیے بالعموم اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے بالخصوص اس قابلِ قدر تصنیف کا مطالعہ ضروری ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ ہے۔
